نگار
غالب نمبر

سالنامہ نگار سنہ ۱۹۶۱ء
غالب نمبر

غالب کی سب سے آخری تصویر

عطیہ غالب اکاڈمی بنارس

سالنامہ نگار ۱۹۶۱ء

غالب نمبر

مرتبہ نیاز فتحپوری

کچھ تصویر کے متعلق

غالب کا مصرع ہے

ہم سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی

لیکن نواب علائی نے صرف یہ غزل ہی غالب سے نہیں لکھوائی بلکہ اُن کی تصویر بھی بہ جبر کھنچوائی اور وہ اس طرح کہ جب انتہائے ضُعف کی وجہ سے وہ نقل و حرکت سے معذور تھے تو ان کو سہارا

دے کر کرسی پر بٹھایا گیا اور یہ تصویر لی گئی۔

یہ غالب کی بالکل آخری تصویر ہے جس کے چند ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اس تصویر کا بلاک عطیہ ہے جناب خیر بہروی مدیر غالب کا ڈیرہ بنارس کا

نیاز

فروری ۱۹۶۱ء کا پرچہ علیحدہ شائع نہ ہوگا

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

...یسواں سال	فہرست مضامین سالنامہ ۱۹۶۱ء	شمارہ (۱)

غالب کا طرز شاعری

(نیاز فتحپوری)

غالب کے بارے میں اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک اردو شاعری کا چرچا دنیا میں موجود ہے یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ لوگ نئے نئے زاویوں سے غالب کے کلام کا مطالعہ کریں گے، اس کی فنی و معنوی خصوصیات پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالیں گے، اس کے آرٹ کی خوبیوں پر ناقدانہ گفتگو کریں گے اور یہ سب کچھ بڑے شوق سے پڑھا جائے گا۔ لیکن ایسا کیوں ہوگا؟ اس سوال کا صحیح جواب دینا دراصل ایک نفسیاتی مطالعہ ہے، جو غالب سے زیادہ زمانہ کے حالات و رجحانات اور خود غالب کی جدت پسند ذہنیت سے تعلق رکھتا ہے۔

جب تک غالب زندہ رہا، لوگ اسے بہت متوحش نگاہوں سے دیکھتے رہے یہاں تک کہ بعض نے اس کے کلام کو مہمل و بے معنی قرار دینے میں بھی تامل نہ کیا۔ لیکن جب زمانہ بدلا، حالات بدلے اور حالات کے ساتھ لوگوں کی ذہنیت بدلی تو غالب اور اس کا کلام دوبارہ پیدا ہوا، اور جس چیز کو پہلے جنس کاسد سمجھ کر رد کر دیا گیا تھا، اب اسی کو "متاع از دست رفتہ" سمجھ کر سینہ سے لگایا جانے لگا، حتیٰ کہ آج اس سے زیادہ محبوب و مقبول شاعر اردو کا کوئی نہیں۔

بات یہ ہے کہ ہر زمانہ میں بعض ہستیاں قبل از وقت پیدا ہو جاتی ہیں جو دراصل مستقبل کی پیش گوئیاں ہوا کرتی ہیں اور جب مستقبل سامنے آتے ہیں تو لوگ دفعتاً چونک پڑتے ہیں اور ان میں ایک خاص عظمت و تقدس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ غالب بھی اپنے دَور کے لحاظ سے مستقبل کا شاعر تھا اور وہ اپنے اندر چند در چند مستقبل چھپائے ہوئے تھا اور جب کوئی مستقبل ماضی میں بدل جاتا تو موجودہ دور کے نئے مستقبل میں جلوہ گر ہو جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ پچھلی ایک صدی میں شاعری اور خصوصیت کے ساتھ غزل گوئی میں جب جب ذہنی انقلاب پیدا ہوا غالب بھی ابھرتا رہا، یہاں تک کہ موجودہ دور ترقی پسندی میں بعض نقاد اسی کو سب سے پہلا ترقی پسند شاعر کہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں غالب کی شاعری ماضی کی داستان نہ تھی بلکہ مستقبل کا نفسیاتی رجحان تھی جو اول اول نامانوس سی چیز معلوم ہوتی تھی، لیکن بعد کو وہی زمانہ کی انتہائی تمنا قرار پائی۔ غالب چونکہ فطرتاً بڑا خود آگاہ SELF CONSCIOUS شاعر تھا اس لئے وہ خود بھی ان پوشیدہ حقیقتوں اور اپنے اندر چھپے ہوئے امکانات سے واقف تھا اور اسی لئے وہ ایک بار اپنے عہد کی بے حسی کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

غالب کے عہد تک اردو غزل برابر ایک ہی روش پر چلی آ رہی تھی۔ وہی بندھے ٹکے محاورے، وہی سیدھا سادہ روزمرہ، وہی مقررہ تشبیہات و استعارات اور وہی ہجر و وصال کے پامال جذبات حسن و عشق۔ گویا غزل نام تھا صرف سطحی سنائی باتوں کا ایک ہی لب و لہجہ میں دہراتے رہنے کا، اور لوگ عام طور پر اس سے داستان ہی کا سا لطف اٹھاتے تھے، لیکن غالب چونکہ فطرتاً بہت شوخ تخیل، ندرت پسند واقع ہوا تھا، اس لئے یہ داستان سرائی اسے پسند نہ آئی اور وہ محافل شعر و سخن میں بالکل ایک نئے آہنگ کے ساتھ داخل ہوا جس کا مقصد دوسروں کو چونکانا بھی ہو، لیکن اس کا مدعا زیادہ تر خود اپنے ذوق کی تسکین تھی۔

غالب کا یہ آہنگ یقیناً اس کی فطرت کا تقاضا تھا، لیکن وہ پیدا ہوا، اس کی ابتدائی فارسی تعلیم و کلام بیدل کے مطالعہ سے، اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غالب کے طرز شاعری کی ابتدا "رنگ بہار ایجادی بیدل" سے ہوئی۔ لیکن چونکہ بیدل زبان نہیں بلکہ تخیل کا شاعر تھا، وہ زبان کا پابند نہ تھا بلکہ اس کی زبان خود تخیل سے پیدا ہوتی تھی جو حد درجہ مجرد و دقیق تھی، اس لئے اردو اس کی متحمل نہ ہو سکی اور آخرکار غالب کو یہ

رنگ جس سے اس کی اُردو شاعری کی ابتدا ہوئی تھی ترک کرنا پڑا۔

ظاہر ہے کہ یہ رنگ ترک کرنے کے بعد وہ میرؔ، سوداؔ اور میر حسنؔ کے رنگ کی طرف نہ لوٹ سکتا تھا، کیونکہ یہ اس کے ذوق اور اس کی فطری خلاف تھا اس لئے اس نے خود اپنے فارسی ذوق اور دوسرے ایرانی شعراء کے کلام کو سامنے رکھ کر صرف ان فارسی ترکیب کا استعمال کیا جن کی اُردو متحمل ہو سکتی تھی اور اس طرح معنی آفرینی اور ندرتِ بیان، جدتِ اظہار، طرفگیٔ اسلوب سے اُردو غزل کو مالا مال اور غزل گوئی کا بالکل نیا طرز پیدا کیا۔

اُردو میں صاحبِ طرز شعراء اور بھی ہوئے ہیں، جن میں میرؔ، نظیرؔ، ناسخؔ اور مومنؔ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، لیکن فن اور کے لحاظ سے ان سب کا ایک خاص رنگ تھا اور اسی رنگ سے وہ الگ الگ پہچانے جا سکتے تھے، لیکن غالبؔ کی فضائے شعر بڑی متنوع تھی۔ میرؔ کی فضا یکسر یاس و حسرت کی سوگوارانہ فضا تھی جس میں میرؔ کے سرہانے بیٹھ کر زور سے باتیں کرنا بھی آداب کے خلاف تھا غالبؔ نے حسرت و یاس کے بیان میں بھی امیدوں کے خوددارانہ مطالبہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور انتہائی غم کی حالت میں بھی نشاط کی فکر سے غافل نہیں رہا۔ میرؔ کی شاعری موت کی آسودگی تھی اور غالبؔ کی شاعری زندگی کی تڑپ۔

نظیرؔ ایک قلندرانہ انداز کے عوامی شاعر تھے اور اس میں شک نہیں کہ اس خصوص میں ان کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا، غالبؔ اس کے بالکل خواص کے شاعر تھے، ایک ایسے ارسٹاکریٹک (ARISTOCRATIC) شاعر جو اپنی خودداری، اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی عاشقانہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ناسخؔ کی شاعری کا حسن یکسر غازہ و مشاطگی کی شاعری تھی جس سے غالبؔ کو دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ کی شاعری گوشت و پوست کی جنسی شاعری تھی جس میں فلسفیانہ فکر اور متصوفانہ آفاقیت کی کوئی گنجائش نہ تھی، لیکن غالبؔ کے حسن و میں ماورائے حسن و عشق بھی شامل تھا اور اس کی شاعری دراصل نہایت وسیع کائناتی شاعری تھی جو دل و دماغ دونوں کے انتہائی احساس سے تعلق رکھتی تھی وہ روایتی نہیں بلکہ درایتی شاعر تھا، وہ مقلد نہیں مجتہد تھا اور ایک ایسے نئے طرزِ شاعری کا خلاق تھا سے دُنیا بالکل ناواقف تھی۔

چونکہ ماضی کی روایات سے ہٹ کر کوئی نئی بات ایسی کہنا جو ذہنِ انسانی کو دفعۃً چونکا دے آسان نہیں، اس لئے غالبؔ نے اس کے حصول کے لئے نئی زبان پیدا کی، نیا لب و لہجہ اختراع کیا، نیا انداز بیان ایجاد کیا اور جو کچھ کہا اس قدر اعتماد کے ساتھ کہا، ایسی تکی سے کہا گویا وہ ایک کڑکا تھا، ایک تیز و روشن شہابِ ثاقب تھا جس کے سننے اور دیکھنے پر دُنیا مجبور ہو گئی۔

غالبؔ کو روشِ عام بالکل پسند نہ تھی، وہ اپنی راہ سب سے الگ بنانا پسند کرتا تھا، لکیر کا فقیر بننا اس کی فطرت کے منافی تھا، بھی بات کہنے سے اسے سخت نفرت تھی، وہ ہمیشہ کوئی نئی بات نئے اسلوب سے کہنا چاہتا تھا، ہمیشہ وہ نئے نئے زاویے بیان کے تلاش، فارسی کی نئی نئی ترکیبوں سے کام لیتا تھا جن کے استعمال کا ذوق اسے بیدلؔ کے کلام کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا، چنانچہ آپ ئے گا کہ: "یک بیاباں ماندگی" - "جنوں جولاں گدا" - "عرض گرانجانی" - "پرفشانیٔ شمع" — وغیرہ کی متعدد ترکیبیں بالکل بیدلؔ کی ہیں — پھر اگر غالبؔ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ اس خار زار سے شاید کبھی نہ نکلتا، لیکن چونکہ وہ بڑے صحیح ذوق اور طبعِ سلیم کا تھا، اس لئے خود اس نے اُردو میں اس رنگ کی ناہمواری کو محسوس کیا اور فارسی کی صرف ان ترکیبوں سے کام لینا شروع کیا جنہیں مزاج قبول کر سکتا تھا اور یہ تھا غالبؔ کی شاعری کا دوسرا دور، پہلا دور اختراعِ محض اور جوشِ ندرت پسندی کا دور تھا جس میں ندرتِ ترکیبوں کا استعمال ہی پیشِ نظر رہتا تھا اور مفہوم و معنی کی معقولیت نظر انداز کر دی جاتی تھی مثلاً:۔

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

لیکن دوسرا دور بہت سنبھلا ہوا دور تھا جس میں فارسی تراکیب کے ساتھ تغزل کی چاشنی بھی پائی جاتی تھی اور باوجود اشکال پسندی

دقت آفرینی کے داخلی کیفیت بھی اس میں محسوس ہوتی تھی مثلاً:۔

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیر، موجِ آب کو فرصت روانی کی

س کے بعد غالبؔ کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوا، جب فارسی کی لطیف ترکیبوں کے ساتھ، زبان کی شیرینی و حلاوت اور تغزل معنی آفرینی کے ساتھ، اندازِ بیان کی سلاست و روانی بھی شامل ہو گئی مثلاً:۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

اور اس دور کا ارتقاء آخر کار اس حد تک پہنچ گیا کہ غالبؔ کی شاعری یکسر "سحرِ حلال" ہو کر رہ گئی اور اس قسم کے سہلِ ممتنع اشعار ان کے قلم سے نکلنے لگے:۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

غالبؔ کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ پامال مضامین کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتے، عامیانہ تشبیہات و استعارات سے ہمیشہ اجتناب کرتے ہیں اور اگر کوئی مضمون پرانا ہو تو اس کو بھی اپنے اندازِ بیان کی ندرت سے نیا بنا دیتے ہیں۔ مثلاً ذوقؔ، جنت کے تصور پر نہایت عامیانہ انداز میں اس طرح تنقید کرتا ہے کہ:۔

کب حق پرست زاہدِ جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

لیکن غالبؔ کی ندرت کو ملاحظہ فرمایئے، کہتے ہیں:۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

مومنؔ کا مشہور شعر ہے:۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یقیناً مومنؔ کا یہ شعر اتنا بلند و پاکیزہ ہے کہ اس میں ترقی کی گنجائش بظاہر نظر نہیں آتی لیکن غالبؔ اس سے زیادہ بلند سطح پر پہنچ کر یوں کہتے ہیں:

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

موجودات اور مظاہر و آثار سے تفکر کر اعتبار و بصیرت حاصل کرنا مشہور فلسفۂ تصوف ہے جسے دردؔ نے یوں ظاہر کیا ہے:۔

آہستہ سے چل میانِ کہسار
ہر سنگ دکانِ شیشہ گر ہے

غالبؔ کی ندرتِ بیان و ژرف نگاہی ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے:۔

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

تجلی و طور کے سلسلہ میں موسیٰ پر طعن کرنا شاعروں کا بڑا دیرینہ شیوہ ہے، لیکن غالبؔ اسی پامال خیال کو اس طرح ظاہر کرتا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

استعارات و تشبیہات کا استعمال غالبؔ سے پہلے بھی رائج تھا لیکن اس میں کوئی ندرت نہ تھی، غالبؔ پہلا شخص تھا جس فارسی استعارے استعمال کئے اور اس خوبی کے ساتھ کہ اُردو غزل میں جان پڑ گئی مثلاً:۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

غالب کی دوسری خصوصیت جو بہت کم کسی دوسرے شاعر میں پائی جاتی ہے، اس کی شوخی و ظرافت ہے جو اس کی زندگی کی ہر ہر
نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ حالی نے انھیں "حیوانِ ظریف" ہی کہہ دیا۔ اس کے فارسی کلام میں اس کی عجیب و غریب مثالیں ملتی
اُردو میں بھی ایسی دلچسپ مثالوں کی کمی نہیں — اس کی شوخی و ظرافت بھی عامیانہ نہیں، بلکہ خاصہ کی چیز ہے جو صرف انداز
سے پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً:-

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

یا:-
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
زندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالب کی تیسری خصوصیت اس کی خودداری و خود بینی ہے۔ وہ محبت میں تذلل کا قائل نہیں، وہ رونے بسورنے اور ہائے ہائے کو
کرتا۔ وہ اگر محبت کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کی محبت کا احترام بھی کیا جائے، یہاں تک کہ وہ محبوب کے گھر جانے کا تصور بھی کرتا ہے
شان سے کہ:-

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

پھر اس میں خصوصیت دو یاری کی نہ تھی بلکہ بندگی و خدائی کے تعلق میں اس کی یہ خودداری درِ کعبہ تک پہونچ جاتی تھی:-

اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب اس کو اپنی توہین سمجھتا تھا کہ وہ کوئی چیز چاہے اور وہ اسے نہ ملے اور اس غم و غصہ میں وہ اس حد تک پہونچ جاتا تھا کہ:-

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

غالب اپنے جذبات کے لحاظ سے بڑا شدت پسند شخص تھا اور اس کے تاثرات کی شدت کی کوئی حد و پایاں نہ تھی۔ مثلاً محبت میں جذبۂ
لیجئے کہ وہ یقیناً فطری چیز ہے، لیکن غالب کے یہاں یہ جذبہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے اور انسان تو انسان وہ خدا سے بھی جلن
ہے۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مگر یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی وہ خود اپنے آپ پر بھی رشک کرنے لگتا ہے:-

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

وہ محبوب میں اس کے گھر کی تلاش میں جاتے ہیں تو محبوب کا نام تک نہیں لیتے اور صرف یہ پوچھتے پھرتے ہیں کہ: "جاؤں کدھر کو میں"
غالب کی یہ انتہا پسندی اور نزاکتِ خیال خاص عاشقانہ رنگ میں تو زیادہ نمایاں نہیں کیونکہ اس کا میدان زیادہ وسیع نہیں۔
وہ مسائلِ تصوف بیان کرنے پر آجاتے ہیں تو پھر ان کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں رہتی، اس کا کلام فلسفۂ حیات اور مسائلِ حکمت
سے بھرا پڑا ہے اور اس سلسلہ میں اس نے اتنی لطیف، اتنی بلند، اس قدر اچھوتی باتیں کہی ہیں کہ اُردو میں غالب کے سوا
اور نہیں ملتیں۔
آپ تمام شاعروں کے دواوین چھان ڈالئے لیکن غالب کے اس شعر کا جواب شاید ہی آپ کو کہیں مل سکے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اس کی فکر آزادانہ شاعری کے لئے بڑے وسیع میدان کی ضرورت تھی اور یہ بات صرف تصوف ہی میں مل سکتا تھا
تصوف نہیں جس کا تعلق محض خشک اصطلاحات یا بے رنگ رسمی تصوف سے ہے۔

غالب کی شاعرانہ خصوصیات

(نیاز فتحپوری)

احساسِ خودی

کمال کے ساتھ احساسِ خودی ضروری ہے، لیکن بعض کا یہ آنا ظاہر نہیں ہوتا اور بعض کا زبان تک آجاتا ہے۔ فارسی شعراء میں عرفی اور غالب دونوں میں یہ نیت پائی جاتی تھی اور اتنی شدید کہ دونوں نے کھلم کھلا اس کا [اظہار] کیا، اور بار بار کیا۔

عرفی نے تو حد کردی ـــــ لکھتا ہے:-

من کیستم آں سالکِ کونین مسیرم — کز بیختۂ جوہرِ قدس ست خمیرم

یعنی میں وہ ہوں جس کا "خمیر" جوہر قدس" (یعنی لطافت و پاکیزگی) سے ہوا ہے اور جوہر قدس وہ جو پہلے اچھی طرح چھان لیا گیا تھا۔

اسے نزاکتِ خیال کہئے یا مبالغہ، یہ ہے اتنا بڑا دعویٰ کہ اس سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہی جو منصور نے کہا اور سولی پر چڑھ گیا۔

غالب کے یہاں بھی ہم کو بالکل یہی چیز ملتی ہے، لیکن زیادہ لطیف شاعرانہ احساس کے ساتھ۔ جب وہ قمار بازی کی پاداش میں [جیل] بھیجے گئے تو اس نعرہ کے ساتھ قید خانہ میں داخل ہوئے:-

پاسباناں ہمہ آئید کہ من می آیم — در زنداں بکشائید کہ من می آیم

[اے] عزیزاں کہ دریں کلبۂ اقامت دارید — بخت خود را بستائید کہ من می آیم

[یہ] حق کون تھا، اس کی صراحت بھی سن لیجئے کہ:-

انچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی — آفتاب از جہت قبلہ بر آمد گوئی

یعنی تم لوگوں نے سُنا ہوگا کہ کسی وقت آفتاب سمتِ قبلہ (یعنی مغرب) سے طلوع کرے گا اور توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا، [قیا]مت جو کل ہونے والی تھی آج ہی پوری ہوئی جاتی ہے، کیونکہ میرا زنداں میں آنا ایسا ہی ہے جیسے سمت قبلہ سے آفتاب کا [طلو]ع ہوجانا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اظہار خودی میں کتنی لطیف شعریت سے کام لیتے تھے۔

ایک جگہ وہ خسرو و سعدی پر اپنا تفوق ظاہر کرتے ہیں لیکن اس پاکیزہ استدلال کے ساتھ:-

بقدرِ فیض ز مبدا فزونم از اسلاف — کہ بودہ ام قدرے دیرتر دراں درگاہ

ظہور من بجہاں در ہزار و ہفت و دویست — ظہور خسرو و سعدی بہ پیش ششصد و پنجاہ

یعنی خسرو و سعدی کے مقابلہ میں مبداء فیاض سے کسب فیض کا مجھے زیادہ موقع ملا ہے کیونکہ وہ ۶۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور

میں ۱۲۰۰ھ میں یعنی بہ نسبت خسرو و سعدی کے مجھے مبداء فیاض سے کسب فیض کی فرصت زیادہ نصیب ہوئی ہے۔

غالب کو اپنے شاعرانہ کمال کا احساس اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اس سے کسی اور کا استفادہ کرنا بھی ممکن نہ تھا۔

تا ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوے — سایہ ہمچوں دود بالا می رود از بال ما

یعنی میری گرمی پرواز کا یہ عالم ہے کہ میرے پروبال کا سایہ بھی دھوئیں کی طرح بالا ہی بالا چلا جاتا ہے اور میرے سایہ تک بھی کوئی نہیں پہونچ سکتا۔

اسی خیال کو اس نے ایک دوسرے زاویہ سے اُردو میں یوں ظاہر کیا ہے:-

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

غالب کو اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس ایک خاص نوعیت لئے ہوئے تھا۔ یعنی وہ سمجھتا تھا کہ شعراء خود کوشش کرکے فنِ شعر تک پہونچے اور یہاں خود فنِ شعر اس تک پہونچا۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب — شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

ظاہر ہے کہ جو شاعر اتنے زبردست ادعائے خودی کے ساتھ سامنے آئے گا تو اس سے حسد کرنے والے بھی پیدا ہوجائیں گے، لیکن غالب ان کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

بر روئے حاسداں در دوزخ کشادہ تنگ — از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما

یعنی ہم تو اپنی شاعری کے لحاظ سے ایک "جنت در بستہ" ہیں کہ وہاں تک کوئی نہیں پہونچ سکتا، لیکن اس چیز نے حاسدوں کے لئے دوزخ کا دروازہ ضرور کھول دیا ہے جس میں وہ ہر وقت جلتے رہتے ہیں۔

ایک مسلسل غزل میں قدرت کے بعض عطایا کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:-

سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم دادند — ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند — بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند — ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

ہرچہ از دستگہِ پارس بہ یغما بردند — تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

یعنی عرب نے جو دولت عجم سے چھینی تھی وہ سب کی سب قدرت نے مجھے قلم و زبان کی صورت میں دیدی، اسی مضمون کو وہ صرف ایک شعر میں سمیٹ کر یوں کہتے ہیں:-

دانش و گنجینہ پنداری یکے ست — حق نہاں داد انچہ پیدا خواستم

یعنی خزینۂ زر اور علم و عقل دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں آسکتے۔ وہ اگر مجھے نہ ملا تو کوئی مضائقہ نہیں، دوسری چیز تو مجھے مل گئی۔ لیکن اس کے باوجود اگر دُنیا نے اس کی قدر نہ کی تو اس کا سبب یہ تھا کہ:-

نقدِ خردم سکۂ سلطاں نپذیرم — جنس ہنرم گرمی بازار ندارم

اور اگر میں مشہور نہ ہوا تو صرف اس لئے کہ:-

زخم جگرم بخیۂ مرہم نپسندم — موج گہرم جنبش رفتار ندارم

بہادر شاہ کے ایک مدحیہ قصیدہ میں وہ ایک جگہ اہل مذاہب کے مسلک و شعائر کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کلام کی بلندی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ جب یہ تمام اہل اللہ میرا کلام دیکھیں گے تو میری نظم کو آبِ حیات اور نثر کو نسخۂ اعجاز قرار دیں گے، اس کو بار بار نقل کریں گے اور اس سے تفاؤل کیا کریں گے :۔

نظم را موجۂ سرچشمۂ حیواں فہمند   نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بینند
گر بہ نقل بعد گونہ تقاضہ خواہند   گہ بہ فال بعد رنگ تمنا بینند

اسی طرح اپنے ایک منظوم خط میں نواب یوسف علی خاں والی رام پور سے یوں خطاب کرتے ہیں :۔

غالب بہ سخن نام من آمد ازل آورد   والی کرد دریں شیوہ ندیم عامی و جاہل
در فن سخن دم مزن از عرفی و طالب   ایں آئینہ خاصیت کہ بمن شدہ نازل
آں را کہ صریر قلم ہوش ربایہ   دیگر نبرد ذوق ز آواز عنادل

جناب امیر کی منقبت میں غالب نے ایک بڑے معرکہ کا ترکیب بند لکھا تھا اس میں بھی غالب نے اپنا تعارف بڑے لطیف شاعرانہ انداز سے اس طرح کیا ہے کہ میں دوران کے تمام رازہائے سربستہ کا محرم ہوں اور مجھے دنیا میں محض اس لئے ذلیل و خوار رکھا گیا ہے کہ یہ پوشیدہ راز ظاہر ہونے پائیں :۔

محرم رازِ نہان روزگارم کردہ اند   تا بجرم گوش نہد خلق، خوارم کردہ اند

تیسرے بند میں اس سے زیادہ زور کے ساتھ اپنی دولت علم و فضل کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :۔

دلیمی شہرۂ دہر از تہی دستی ست چرخ   رفتہ مسکیں راز یاد و گنج پنہانش منم

آسمان کو گل دلیمی کا طعنہ دینا بیکار ہے کیونکہ اس کا سارا خزانہ تو میرے اندر پنہاں ہے، وہ مجھے کیا دے گا اور میں کیا لوں گا۔

ایک بار کسی نے ان کے ایک شعر پر یہ اعتراض کیا کہ کسی قدیم شاعر کے کلام سے ماخوذ ہے یا اس سے توارد ہوا ہے۔ غالب نے اس پر ایک بڑا عجیب قطعہ لکھا جس میں اپنے مرتبۂ شاعری کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ جس مضمون کو توارد کہا جاتا ہے وہ دراصل میرا ہی مضمون تھا، یعنی مجھ سے پہلے اگر کسی نے کوئی ایسی بات کہی ہے تو دراصل وہ میری ہی ملکیت تھی جو نہاں خانۂ ازل میں محفوظ تھی اور چرا لی گئی :۔

ہزار معنیٔ سرجوش خاص ملک من ست   کہ اہل ذوق دل و دیگری از عمل من برد ست
ز رفتگاں بہ یکے گر توارد م رو داد   ہماں کہ خوبی آرایش غزل برد ست
مراست ننگ وے فخر است کاں بجنس   پس از فکر رسا جادہ ان محمل برد ست
میر گماں کہ توارد یقیں شناس کہ دزد   متاع من ز نہانخانۂ ازل برد ست

غالب، عرفی و زلالی کا بڑا قائل تھا، لیکن ایک جگہ شعرائے پیشیں کے ذکر کے سلسلہ میں یہ لکھتے ہوئے کہ "پیشینیاں چراغہا بردہ اند و من آفتاب بستم" اپنی برتری کو اس طرح ظاہر کرتا ہے :۔

مسیح شوکت عرفی کہ بود شیرازی   مشو اسیر زلالی کہ بود خوانساری
بہ سومنات خیالم در آئے تا بینی   رواں فروز برہ دوش ہائے زناری

ایک قطعہ میں اس نے اپنے نسب کی بلندی و برتری کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے فضل و کمال کا ذکر اس طرح کیا ہے :۔

اور ز معنی سخن گزاردہ   خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را ہمینہ شاگردیم   عقل کل را ہمینہ فرزندیم

ایک اور قطعہ میں اپنی فارسی شاعری پر یوں تبصرہ کرتا ہے :۔

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال   مانی و ارژنگم و آں نسخۂ ارتنگ من است

ایک مدحیہ قطعہ میں اپنا تعارف اس طرح کیا ہے :۔

چوں تازہ کنم در سخن آئین بیاں را   آوازہ دہم شیوۂ رباب صفہاں را
رقاصہ قلم بیخود و من خود زرہ مہر   بر زہرہ فشانم اثر جنبش آں را

مسائل تصوف

تصوف و حقائق تصوف کے سلسلہ میں بھی غالب کو اپنے درک و بصیرت پر ناز تھا چنانچہ ایک جگہ انھوں نے برملا کہہ دیا کہ :۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

حالانکہ یہ بات ذرا گری ہوئی ہے کہ بادہ خوار ہونے کی وجہ سے وہ اپنی ولایت کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ دراصل کہنا یہ چاہئے تھا کہ :۔

تو کبھی ولی نہ ہوتا جو نہ بادہ خوار ہوتا

کیونکہ مسائل تصوف کے سلسلہ میں غالب کے وہی اشعار زیادہ بلند ہیں جو "عروج صہبا" ہی کے وقت کہے جا سکتے تھے۔

غالب کا ایک مشہور شعر ہے :۔

ہے مشتمل وجود صور پر وجود بحر   یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

جو یقیناً اس وقت ہوا ہوگا جب کئی دن تک انھیں شراب نہ ملی ہوگی، برخلاف اس کے یہ شعر دیکھئے :۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب   ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

کہ یہ خیال اس وقت تک غالب کے ذہن میں آ ہی نہ سکتا تھا جب تک وہ مست و سرشار نہ ہوتا۔

تصوف دیگر عجم کی پیداوار ہے، عرب و اہل عرب کو اس سے کوئی لگاؤ نہ تھا، اسی لئے عربی شاعری میں تصوف کا وجود نہیں اور عجمی شاعری کا طرۂ امتیاز ہی بیان تصوف ہے، چنانچہ غالب کے یہاں بھی تصوف کا زیادہ عنصر اس کے فارسی کلام ہی میں پایا جاتا ہے اور اردو میں اس کے مسائل تصوف زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن بعض حضرات نے اردو فارسی دونوں میں زیادہ تر اس کے بیان تصوف ہی کو بہت سراہا ہے اور اس سلسلہ میں بربنائے حسن ظن ان اشعار کو بھی لے لیا ہے جو تصوف سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ مثلاً :۔

ہے آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے   بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے
جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیم روز   آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست   لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ   کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی   مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

سوز ترا بدل ہمہ در خویشتن گرفت
از داغ تشنہ بجگر بستہ ایم ما

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبح بہارے شب ماہے دریاب

بجود بزیر سایۂ طوبیٰ غنودہ اند
دستش نگیر ہمرواں تمنا بلند نیست

ہمچو دانے کہ بہ پستی زول آید بیروں
از بہاراں ہمہ بوییت و صبا می آید

گم شد نشان من چو رسیدم بکنج دیر
مانند آں صدا کہ بگوشش گراں رسید

یک گریہ پس از ضبط دو صد گریہ بداده
تا تحفۂ آں دہر توانم بگلو برد

ہر جنبشے دامنشانے درخورست
بوئے پیراہن بکنعاں می رود

بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں
کس نفس از جدل نزد کس سخن از فدک نخواست

زمام ناقہ بدست تصرف شوق ست
بسوئے قیس گرایش زساربان نبود

"تیغت ز فرق تا بگلویم رسیدہ باد"
شوخی ز حد گذشت زبانم بریدہ باد

ذوقے ست ہمدمی بلبلاں بگزرم زرشک
خار رہت بپائے عزیزاں خلیدہ باد

دمید دانہ و بالید و آشیانگہ شد
در انتظار ہما، دام چیدہ ایم بنگر

متذکرۂ بالا اشعار کو جو خالص عاشقانہ رنگ کے ہیں، حقیقت و معرفت کی طرف لیجانا بڑی ناروا جسارت ہے۔

غالب کے یہاں تصوف کے اشعار یقیناً پائے جاتے ہیں لیکن سب کے سب معیاری نہیں ہیں۔ بعض وہ اشعار جن میں تصوفین ...وں کو صاف صاف کھلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان میں تصوف تو یقیناً ہے، لیکن "غالبیت" ان میں بالکل نہیں یا بہت کم ...ی ہے۔ مثلاً:-

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

...ے ذوق ہمدمی کا تقاضہ ہے کہ آہ و فغاں میں کچھ اور لوگ بھی میرے شریک ہو جائیں، اس لئے جذبۂ رشک سے گزر کر میں اب یہی چاہتا ہوں کہ خدا کرے تیرے ...
...ئے دوسروں کے پاؤں میں چبھ جائیں اور وہ بھی میرے ساتھ آہ و فغاں میں مبتلا ہوں۔

توئی قبلہ رو چو نسبت ادب مجو غالب
ندیدۂ کہ بسوئے قبلہ پشت محراب ست

زوہم نقش خیالے کشیدہ ای دریہ
وجود خلق چو عنقا بدہر نایاب ست

نشاط معنویاں از شرابخانۂ تست
فسون بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

آخر منزل عدم نقش پئے تو راہ می زند
اول منزل دگر بوئے تو زاد میدہد

کفر و دیں چیست جز آلایش پندار وجود
پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

کو فنا تا ہمہ آلایش پندار برد
از صور جلوہ و از آئینہ زنگار برد

ان اشعار میں جو مسایل تصوف بیان کئے گئے ہیں، وہ بہ لحاظ بیان اپنے اندر کوئی ندرت نہیں رکھتے، لیکن جب غالب اس سطح سے بلند ہو کر لطیف تعبیرات کے ذریعہ سے حقایق تصوف کو پیش کرتا ہے تو غالب کی انفرادیت پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

خطے بہ ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن
زخود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

رواج صومعہ ہستی ست زینہار مرو
متاع میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

آں راز کہ در سینہ نہان ست نہ وعظ ست
بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

قفس و دام را گنہے نیست
رنگینی در نہاد بال و پرست

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند
ہم خزاں ہم بہار در گزرست

اے کہ بدیدہ ام زتست ویکہ بسینہ غم زتست
نازش غم کہ ہم زتست خاطر شاد می رود

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

ہر کجا دشنۂ شوق تو جراحت بارد
جز خراشے بجگر گوشۂ ادہم نرسد

طوبیٰ فیض تو ہر جا گل و بار افشاند
جز نسیمے بہ پرستشگہ مریم نرسد

بشرع آویز و حق می جو ز مجنوں کم نئی بارے
دلش با محمل ست اما زباں با ساربان دارد

چرا بہ سنگ دگرم بیچی اے زبانۂ طور
نداد دیدہ بدل در رہ و زجان برخیزد

بعض اشعار تصوف غالب نے بیدل کے رنگ میں بھی لکھے ہیں۔ مثلاً:-

ذوق سودائے تنک بست آسماں نا امیدش
دیدہ بر خواب پریشاں زد جہاں نا امیدش

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غالب کی یہ تمنا پوری ہوکر رہی اور اس شان کے ساتھ کہ اس کے ہمعصر شعراء میں آج جو درجۂ قبول اسے حاصل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوسکا۔ اس کی زندگی کا کوئی رخ ایسا نہیں جس پر گفتگو نہ کی گئی ہو اور اس کی شاعری کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اکابر علم و ادب نے بار بار اظہار خیال نہ کیا ہو۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ غالب کو زیادہ تر ناز اپنی فارسی شاعری پر تھا (جسے وہ "نقشہائے رنگ رنگ" کہتا ہے) اور شہرت اسے حاصل ہوئی اردو کے "مجموعۂ بے رنگ" سے، جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ فارسی ذوق غالب کے بعد تقریباً مفقود ہوچکا تھا اور اردو ارتقائی دور سے گزر رہی تھی۔

فارسی شاعری غالب کی فطری ودیعت تھی جس کو ترقی دی محض اس کے ذوق نے چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتا ہے کہ:-

"شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہروی مجھ کو جتائی، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ فنا کردیا، ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور کمر میں زاد راہ باندھا، اور نظیری نے اپنی روش خاص پر مجھ کو چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص جولانی میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا۔" (یادگار غالب)

غالب کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کن کن اساتذۂ فارسی سے استفادہ کیا۔

اپنے اشعار میں جابجا وہ ان اساتذہ فارسی کا ذکر بھی کرتا ہے۔ ایک جگہ ظہوری کو اس طرح یاد کرتا ہے:-

ما را مدد ز فیض ظہوری ست در سخن

دوسری جگہ صائب و ظہوری دونوں کا ذکر ایک ساتھ اس طرح کرتا ہے:-

ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیروں — با ظہوری و صائب محو ہمزبانیہاست

ایک شعر میں وہ اپنے آپ کو عرفی کا جانشین قرار دیتا ہے:-

چوں نتازد سخن از مرحمت دہر بخویش — کہ ز برد عرفی و غالب بعوض باز دہد

ایک اور جگہ اپنے آپ کو نظیری کا ہمسر قرار دیتا ہے:-

ز فیض نطق خویشم با نظیری ہمزباں غالب — چراغے را کہ دودے ہست در سر زود درگیرد

غالب نے اپنی ابتدائی تعلیم کا ذکر کھل کر کہیں نہیں کیا، لیکن کلاسکل فارسی کی تعلیم یقیناً ہوئی ہوگی، کیونکہ اس وقت کا عام نصاب یہی تھا، رہا یہ سوال کہ غالب کو اتنا بلند و پاکیزہ ذوق فارسی کا کہاں سے ملا۔

غالب نے اپنی تعلیم کے سلسلہ میں ایک جگہ کسی ایرانی نژاد عبد الصمد کا ذکر ضرور کیا ہے جس سے غالب نے دو سال تک "حقایق و دقایق زبان پارسی" معلوم کئے، لیکن کسی زبان کے محض "حقایق و دقایق" معلوم کرلینا ایک شخص کو ادیب و شاعر نہیں بنا سکتا، اس لئے صحیح بات وہی ہے جو غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ:- "فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر"۔ اور یہی فطری مناسبت تھی جس نے غالب کو ممتاز ایرانی شعراء کی صف میں بھی خاص جگہ دی۔ ہوسکتا ہے کہ میرے اس خیال سے سب کو اتفاق نہ ہو، لیکن اگر شعراء ایران کے کلام سے "فرمودہائے غالب" کا موازنہ کیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالب بڑی چیز تھا۔

دم خاکے ریخت در چشم بیاباں دیدمش — قطرۂ بگداخت بحر بیکراں نامیدمش
باد دامن زد بر آتش نو بہاراں خواندمش — داغ گشت آں شعلہ از مستی خزاں نامیدمش:

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمار دلبری — در دل سنگ بنگرد رقص بتان آزری
اے کہ تو ہیچ ذرہ را جز بہ رہ تو روئے نیست — در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری
حیف کہ من بخوں تپم و ز تو سخن رود کہ تو — اشک بدیدہ بشکری، نالہ بسینہ بشکری

تذکرۂ بالا اشعار غزل یقیناً مسایل تصوف سے تعلق رکھتے ہیں اور غالب نے ان کے اظہار میں بڑی شاعرانہ لطافت و پاکیزگی
یا ہے۔

الب کا منظوم کلام جو کلیات غالب کے نام سے شایع ہوا ہے، اس کا حجم ۵۰۳ صفحات کو محیط ہے اور ۶۹ قطعات، ایک مخمس، بند، ایک ترجیع بند، گیارہ مثنویوں، ۶۴ قصاید، ۱۰۴ رباعیوں اور ۳۴۰ غزلوں پر مشتمل ہے۔

صیدوں اور غزلوں کے اشعار تین تین ہزار سے کچھ اوپر ہیں اور مثنوی کے ابیات دو ہزار کے قریب ہیں۔ اس طرح پورا کلیات ب دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اور ان میں سے فلسفہ و تصوف کے اشعار دو تین سو سے زیادہ نہ ہوں گے اس لئے یقیناً یہ یادتی ہے کہ ہم انھیں چند اشعار کو سامنے رکھ کر غالب کے ذوق شاعری کے متعلق یہ فیصلہ کردیں کہ غالب صرف صوفی، فلسفی و شاعر تھا جیسا کہ بعض حضرات نے ظاہر کیا ہے۔ تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کے یہاں تصوف و الہیات کے جو خیالات ہ بڑے لطیف و پاکیزہ ہیں جس کا خود اس کو بھی پورا پورا احساس تھا اور اسی لئے اس نے یہ پیشین گوئی بھی کردی تھی کہ:-

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

ب کو زندگی بھر یہی شکوہ رہا کہ اس کا صحیح قدر شناس کوئی نہیں، چنانچہ ایک جگہ اس پر اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"حیف کہ ابنائے روزگار سخن گفتار مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ مایہ شناسائے فرۂ ایزدی نگشتند و ازیں تابشہائے نظر افروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام، سرگراں گزشتند"

لانا حالی نے غالب کے مرتبۂ شاعری اور اس کی کس مپرسی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

"وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے، جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لیجائے، جو رباعی میں خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی و بے مزہ معلوم ہوں، اس کو بہادر شاہ ظفر کی سرکار سے صرف ۵۰ روپیہ ماہوار ملتا تھا اور وہ بھی ۷-۸ برس سے زیادہ نہ ملا۔"

ب کی کس مپرسی کا یہ عالم اس وقت کی بات ہے جب فارسی کا ذوق ملک میں مایل بہ انحطاط ضرور تھا لیکن ختم نہ ہوا تھا اور آزردہ، ومن، حسرتی و تیر وغیرہ ایسے شعراء فارسی موجود تھے۔ اس لئے غالب کو سمجھنا چاہئے تھا کہ جب خود اس کے زمانہ میں غالب شعر ندہ اس کی کیا توقع ہوسکتی تھی، لیکن ایسا سمجھتے ہوئے اسے دکھ ہوتا تھا اور اسے یقین نہ آتا تھا کہ قدرت اتنی بے رحم ہوسکتی ہے گرانمایہ کو ہمیشہ کے لئے ختم ہوجانے دے اور اسی اعتماد نے اس سے کہلوا دیا کہ:-

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

یوں تو فارسی تذکروں میں بہت سے ایرانی شعراء کا نام نظر آتا ہے، لیکن پچھلے تیرہ سو سال میں کتنے شاعر ایران نے ایسے پیدا کئے جن کو
انے یاد رکھا، اس کا جواب بہت مایوس کن ہے۔

فارسی شاعری کا اسلامی دور تیسری صدی ہجری یعنی دولت عباسیہ کے زوال سے شروع ہوتا ہے، جب خراسان میں طاہر ذوالیمینین
خود مختار سپہ سالار کی حیثیت سے مامور تھا۔ لیکن طاہری دور میں ہمیں کسی قابل ذکر شاعر کا نام نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد سامانی
ان کی حکومت میں بھی صرف دو قابل ذکر شاعروں کا نام نظر آتا ہے، رودکی جسے فارسی غزل کا ابو الآباء سمجھا جاتا ہے اور دقیقی
نے شاہنامہ کی ابتدا کی تھی۔

غزنوی دور فارسی شاعری کے لئے زیادہ خوشحالی کا دور تھا، لیکن دو صدی کے اس طویل دور میں جتنے شاعر پیدا ہوئے انھیں
وسی کے علاوہ کوئی قابل ذکر نہیں، البتہ ادب قدیم کے مطالعہ کے سلسلہ میں عنصری، فرخی، اسدی اور منوچہری پر بھی ایک
ری نگاہ ڈال لی جاتی ہے، لیکن غائر مطالعہ صرف فردوسی کا کیا جاتا ہے۔

جب پانچویں صدی ہجری میں غزنوی حکومت کو زوال شروع ہوا تو فارسی شاعری پر بھی اس کا اثر پڑا، لیکن زیادہ دن نہ گزرنے
تھے کہ سلجوقی حکومت کا دور شروع اور سلطان سنجر کا دربار پھر شعر و ادب کا مرکز بن گیا، لیکن اس مرکز سے بھی نظامی، خاقانی،
انوری کے علاوہ کوئی تیسرا ایسا نہ اٹھا جس کو یاد رکھا جائے۔

اس کے بعد تاتاری فتنہ شروع ہوا اور فارسی شاعری کا پچھلا دور بھی ختم ہوا جس میں سوائے قصیدہ و مثنوی کے ہمیں کچھ نظر نہیں
جب دنیا نے پھر اطمینان و سکون کی سانس لی، تو ترکوں اور مغلوں کا زمانہ تھا اور اسی دور میں غزل کا صحیح مفہوم متعین ہوا،
آپ یہ سن کر حیرت کریں گے کہ سوائے سعدی اور حافظ کے تیسرے غزل گو کا نام اس عہد میں بھی نہیں لیا جا سکتا (امیر خسرو بھی
دور کے شاعر تھے لیکن وہ ہندوستان کے تھے، ایران کے نہ تھے) تصوف میں بے شک عطار، عراقی، مولانا روم،
وحدی نے کافی شہرت حاصل کی اور قصیدہ گوئی میں کمال اسمٰعیل اور سلمان ساوجی نے نام پیدا کیا، لیکن تغزل کا
صرف سعدی و حافظ تک محدود تھا۔

اب وہ زمانہ آیا جب ایران میں صفوی خاندان برسر حکومت تھا اور ہندوستان میں تیموری خانوادہ۔ وہ بھی علم و ادب
شناس، یہ بھی فضل و کمال کا جوہری۔ لیکن سلاطین تیموریہ کی حکومت و دولت وسیع تھی اس لئے صفوی خاندان اس
میں کامیاب نہ ہو سکا اور سرزمین ایران کے بہترین شعراء کھنچ کھنچ کر ہندوستان پہونچ گئے۔ لیکن ان "ایران نژاد" بہترین
میں سے آج کتنوں کا نام زندہ ہے؟ صرف پانچ کا۔ یعنی عرفی، نظیری، طالب آملی، صائب اور ابو طالب کلیم۔ (فیضی بھی اسی
شاعر ہے لیکن ایرانی نہیں تھا اس لئے اس کا نام اس سلسلہ میں نہیں لیا جا سکتا)

ابوالفضل نے آئین اکبری میں دربار شاہی تک پہونچنے والے شاعروں کی طویل فہرست دی ہے، لیکن ان پانچ کے سوا کوئی
نہیں، ہر چند مغلوں کی حکومت ہندوستان میں عرصہ تک رہی، لیکن شاعری کے لحاظ سے جہانگیری عہد، فارسی شاعری کا
عہد تھا جس کے بعد کوئی مشہور شاعر نہ ایران میں پیدا ہوا نہ ہندوستان آیا۔

اب غور فرمایئے کہ تیسری صدی سے لیکر گیارھویں صدی کے وسط تک تقریباً ایک ہزار سال کی مدت میں ایران نے جتنے قابل
اعر پیدا کئے ان کی فہرست یہ ہے:- رودکی، دقیقی، فردوسی، نظامی، خاقانی، انوری، سعدی، حافظ، کمال اسمٰعیل

صائب، عرفی، نظیری، طالب آملی، اور ابو طالب کلیم۔ اور جب ہم ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کا ذکر کرتے ہیں تو مقابلتاً
انھیں چندہ ایرانی شاعروں میں سے کسی کا نام لیا جاتا ہے۔ یعنی اگر مثنوی کا ذکر آتا ہے تو فردوسی و نظامی سامنے آجاتے ہیں،
قصیدہ کی بحث ہوتی ہے تو خاقانی و انوری کا کلام پیش کیا جاتا ہے اور غزل میں سعدی، حافظ، عرفی، نظیری اور صائب و کلیم کا۔
(خسرو، فیضی ایرانی نہ تھے اس لئے ان کا نام میں نے نہیں لیا)

اگر خسرو کو علحدہ کر دیا جائے جنھوں نے خلجیوں اور تغلقوں کا عہد بھی دیکھا تھا تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا
عام ذوق مغلیہ عہد سے شروع ہوا اور اسی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اکبر و جہانگیر کے زمانہ میں اس کا شباب تھا اور شاہجہاں کے
بعد سے اس میں انحطاط ہونا شروع ہوا، یہاں تک کہ عہد مغلیہ کے اختتام تک (تقریباً دو صدی کے اندر) شاہجہاں کے
آخری زمانہ میں صرف ایک بیدل پیدا ہوا اور بہادر شاہ کے زمانہ میں غالب۔ ہر چند دو سو سال کے اندر ہندوستان میں فارسی
کے صرف دو قابل ذکر شاعروں کا پیدا ہونا کوئی عجیب بات نہیں، لیکن حیرت تو ایران پر ہے کہ وہ بھی اس زمانہ میں کوئی شاعر
پیدا نہ کر سکا اور اس سے قبل بھی جب وہاں اس پیداوار کی کمی نہ تھی تو ایک ہزار سال کے اندر قابل ذکر شاعروں کی تعداد
وہاں چندہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔

اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ صحیح معنی میں شاعر مشکل ہی سے کوئی پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم ایران کے مقابلہ
میں (جس نے ایک ہزار سال میں صرف چندہ شاعر پیدا کئے) ہندوستان کی طرف سے چار پانچ صدی کے اندر پانچ شاعروں کا نام
بھی پیش کر سکیں تو یہ کوئی معمولی بات نہ ہوگی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت نہ کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے انھیں پانچ مشہور شاعروں میں
ایک غالب بھی تھا۔

ہندوستان کا سب سے پہلا فارسی شاعر جس کا جواب جامعیت کے لحاظ سے ایران کی سرزمین بھی پیش نہیں کر سکتی، خسرو تھا
ان کی شاعری و زباندانی کا یہ مرتبہ تھا کہ عرفی، حافظ اور جامی کو اس کا اعتراف کرنا پڑا، اور اگر ہم تمام ان علوم و فنون کو سامنے رکھیں
جن کے وہ ماہر تھے، تو ایران کے تمام شعراء مل کر بھی خسرو کے پلّہ کو ہلکا نہیں کر سکتے۔

فارسی شاعری میں انھوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ سبھی کچھ کہا اور جو کچھ کہا وہ ایران کے بہترین غزل کہنے والوں، مشہور مثنوی
کہنے والوں اور بلند ترین قصیدہ نگاروں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا ہندی نژاد شاعر جس نے ایرانی شاعروں سے اپنا لوہا منوالیا، فیضی تھا۔ یہ بھی اپنی جامعیت کے لحاظ سے دربار اکبری کے ت
شاعروں پر بھاری تھا اور ایک غزل کو چھوڑ کر اس میں تو بے شک وہ عرفی اور نظیری کے برابر نہیں پہونچا لیکن اور تمام اصناف سخن میں استا
حیثیت کا مالک تھا۔

تیسرا شاعر جس کی شاعری معنوی حیثیت سے اپنا جواب نہیں رکھتی میرزا عبدالقادر بیدل تھا۔ یقیناً بیدل کی شاعری ایرانی انداز
کی شاعری نہیں، لیکن جو زبان اس نے پیدا کی اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ بیدل ہی کے ساتھ ہم کو میرزا مظہر جانجاناں کا نام بھی
لینا چاہئے جن کی غزل گوئی میں سعدی و ما بعد سعدی دونوں زبانوں کا رنگ سمویا ہوا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کا صرف ایک شا
رہ جاتا ہے جسے ہم ایران کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں اور وہ غالب ہے جسے اُن کی زباندانی اور معمولات شعری کے لحاظ سے اُن ایرا
شعراء کی صف میں جگہ دینی چاہئے جو اکبر و جہانگیر کے دربار سے وابستہ تھے اور جن کی شاعری آج بھی متاع گراں ارز سمجھی جاتی ہے۔

یوں تو شاعری کے تمام اصناف کا تعلق صرف طرزِ ادا و اندازِ بیان سے ہے، لیکن غزل کی کامیابی خصوصیت سے اسی پر منحصر ہے
غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے اور جب تک حسنِ ادا سے کام نہ لیا جائے اس میں کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوتی۔
غزل کا موضوع یقیناً حسن و عشق ہے، لیکن حسن و عشق کی دنیا کو صرف عجز و افتادگی یا زاری و تضرع تک محدود سمجھنا درست
محبت کرنے والا بہرحال انسان ہوتا ہے اور تمام انھیں جذبات کا حامل ہوتا ہے جو فطرتاً ایک انسان میں پائے جانے چاہئیں البتہ
یں بات میں ہوتا ہے کہ کس میں کوئی خاص جذبہ زیادہ قوی ہوتا ہے اور کسی میں ضعیف اور اسی جذبہ کی قوت و ضعف کے لحاظ
س کا رنگ شاعری متعین ہوتا ہے۔
چونکہ سعدی میں جذبۂ سپردگی و افتادگی زیادہ قوی تھا اس لئے ان کے اسی رنگ کے اشعار زیادہ کامیاب ہوئے لیکن اسکے
نہیں کہ اس مخصوص جذبہ سے ہٹ کر جو کچھ کہا جائے گا وہ شاعری یا تغزل سے یکسر خارج سمجھا جائے گا۔
سعدی و حافظ کے زمانہ کا اندازِ سخن ایرانی شاعری کے دورِ آخر میں بہت کچھ بدل گیا تھا، اس لئے طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان
ظ سے سعدی و حافظ کا مقابلہ عرفی و نظیری سے کرنا بھی غلطی ہے چہ جائیکہ غالب سے جو سعدی و حافظ کے صدیوں بعد پیدا ہوا
لیکن "روحِ تغزل" کے لحاظ سے یقیناً یہ مقابلہ درست ہو سکتا ہے۔

ب کا تغزل

سعدی سے پہلے بھی فارسی میں غزل گوئی پائی جاتی تھی، لیکن کم اور غیر ترقی یافتہ، اور اس کا سبب یہ تھا کہ
غزل کے لئے جس زبان کی ضرورت ہے وہ پیدا نہ ہوئی تھی اور عام طور پر شعراء قصاید کی طرف مایل تھے۔
ی کی شہرت غزل گو ہونے کی حیثیت سے صرف اسی بنا پر قایم ہوئی کہ انھوں نے دیگر اصناف شاعری کے ساتھ غزل کی طرف بھی
جہ کی اور چونکہ فطرتاً عاشقانہ ذوق اور دردمند دل رکھتے تھے اس لئے ان کے تغزل میں وہ سوز و گداز پیدا ہو گیا جو اس سے
دوسرے شعراء کے کلام میں مفقود تھا۔ علاوہ اس کے زبان بھی ان کے زمانہ میں اتنی سادہ ہو چکی تھی کہ جذبات محبت کا
بے تکلفی سے ہو سکتا تھا۔
غالب یقیناً سعدی کے رنگ کا شاعر نہ تھا، یعنی عشق کی وہ شدید کیفیت وہ شیفتگی و بے خودی، وہ سپردگی و افتادگی جو واقعی تغزل
ن ہے اور سعدی کے یہاں بہت نمایاں طور پر نظر آتی ہے، غالب کے یہاں اتنی شدت کے ساتھ نہیں پائی جاتی، لیکن اس سے
کالنا کہ غالب کے یہاں یہ چیز سرے سے مفقود ہے، درست نہیں۔
اول تو فارسی زبان میں غالب کے زمانہ تک بہت کچھ تغیر ہو گیا تھا اور اسی کے ساتھ اندازِ بیان اور لب و لہجہ بھی کچھ اور ہو گیا تھا
اس کے چونکہ غالب فطرتاً زیادہ شوخ و خود دار تھا، اس لئے سعدی کی سی بیچارگی و بیکسی تو اس میں نہیں ہے لیکن واردات
کے اظہار کی اور جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ سب اس کے یہاں نہایت تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔
سعدی کے تغزل میں تین رنگ کے اشعار پائے جاتے ہیں، ایک وہ جن میں غمزدہ افتادگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ دوسرے وہ جن میں
رنگ اختیار کیا گیا ہے اور تیسرے وہ جن کا تعلق جدتِ ادا سے ہے۔ ان کے پہلے رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

من چہ در پائے تو ریزم کہ خورائے تو بود　　سر نہ چیزیست کہ شایستہ پائے تو بود
حدیثِ حسن خود از دیگراں مپرس　　کہ سعدی در تو حیران ست و مدہوش
او خود گر بلطف خداوندی کند　　ورنہ ما چہ بندگی آید پسندِ او

ہر کہ می بینم از بارِ غمت می گوید　　سعدیا بر تو چہ رنج ست کہ گداختہ
تو پادشاہ، کجا یاد پاسباں آری　　ترا چہ غم کہ مرا در غمت نگیرد خواب

اس میں شک نہیں کہ ان اشعار میں نہایت سادگی و عجز کے ساتھ جذبات عشق کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ رنگ سعدی کے ساتھ
ختم ہو گیا۔ لیکن غالب کے یہاں بھی اس رنگ کے اشعار کچھ کم سوز و گداز کے ساتھ کافی تعداد میں مل سکتے ہیں :-

جان غالب، تاب گفتارے، گمانداری ہنوز　　سخت بیدردی کہ می پرسی ز ما احوال ما

تم مجھ سے میرا حال پوچھتے ہو! شاید تم سمجھتے ہو کہ مجھ میں تم سے تاب گفتگو ابھی تک باقی ہے ۔ اف ری بے دردی !۔
اظہارِ بیکسی و بیچارگی کی ایک اور دلکش مثال ملاحظہ ہو :-

خرسندی غالب نبود زیں ہمہ گفتن　　یکبار بفرمائے کہ "اے بیکس ما"

حالِ دل کے اظہار میں عاشق عجیب عجیب باتیں کہتا ہے اور مختلف طریقوں سے محبوب کو اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتا ہے،
غالب جس سادگی مگر قوت کے ساتھ اس کا ذکر کرتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے ۔ لکھتا ہے :-

پہلو بشگافید و ببینید دلم را　　تا چند بگویم کہ چنان ست و چنان نیست

سوزشِ محبت کے اظہار میں عام طور پر شعراء آتش و برق یا ان کے متعلقات سے استعارہ کیا کرتے ہیں اور یہ ایسی پیش پا
افتادہ بات ہے کہ اس سے کوئی لطف حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ سعدی کہتے ہیں :-

در سوختہ پنہاں نتواں داشتن آتش　　با ہیچ نگفتیم و حکایت بدر افتاد

میں نے کسی سے کچھ نہ کہا اور میرے جلنے کا حال سب کو معلوم ہو گیا، سچ ہے اس آگ کو چھپانا ممکن نہیں ۔ لیکن غالب اسی
خیال کو زیادہ بہتر انداز میں یوں ظاہر کرتا ہے :-

نہ دمید شرارہ نہ بجا ماند رماد　　سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

نہ چنگاریاں اٹھتی ہوئی نظر آئیں اور نہ راکھ ہی کا کہیں پتہ ہے ۔ پھر یہ تو یقینی ہے کہ میں جلا، لیکن جلانے والے نے مجھے
کس طرح جلایا، اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔
زندگی سے بیزاری کا اظہار سبھی شعراء کرتے ہیں، لیکن غالب کا اندازِ بیان ملاحظہ ہو :-

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز　　مگذارید کہ ماتمزدہ تنہا ماند

غالب نے صرف لفظ "ماتمزدہ" میں جذبات کا وہ طوفان سمیٹ کر رکھ دیا ہے، جس کے اظہار کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔
تغزل کے سلسلہ میں کبھی کبھی شاعر وادیات سے ہٹ کر کافرانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے، اسکی مثال میں غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو :-

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست　　ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

سعدی کے رنگِ تغزل میں غالب کی ایک ہی غزل کے چند اشعار اور سنئے :-

بیا، و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر　　چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
ز من بجرم تپیدن کنارہ می کردی　　بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامیدنیم　　ندیدن تو شنیدیم، شنیدنم بنگر

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:-

بلبل بچمن بہ نگہ و پروانہ بمحفل   شوق ست کہ در وصل ہم آرام ندارد

قدر مشتاقاں چہ داند درد ما چندش بود   آنکہ دائم کار با دلہائے خرسندش بود

گاہ گاہ از تقوم ست و غزلخواں بگریز   ورنہ بر عہدۂ من نیست کہ رسوا باشم

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد   ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

از دل قست انچہ بر من می رود   می شناسم سختی ایام را

شیخ سعدی نے اس رنگ کے علاوہ محاکات و معاملات، تشبیہات و استعارات، تعبیرات و ظریفات کی بھی شاعری کی ہے، لیکن غالب کے یہاں یہ باتیں بہت کثرت و تنوع کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ سعدی کے تمثیلی رنگ کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

لبت بدیدم و لعلم بیوفتاد ز چشم   سخن بگفتی و قیمت برفت لولو را

اے کہ چو حسن قامت سرو ندیدہ ام بسی   گر ہمہ دشمنی کنی از ہمہ دوستاں بہی

سروے بلب جوئے گویند چہ خوش باشد   آنانکہ ندیدستند سروے بلب آبے

آپ نے دیکھا کہ یہ اشعار اُن کے حقیقی رنگ کے مقابلہ میں کتنے کمزور اور کس قدر بے مزہ ہیں۔ لب کو لعل، دانتوں کو موتی اور قد کو سرو، سعدی سے پہلے بھی کہا جاتا تھا، انھوں نے اس میں کوئی جدت پیدا نہیں کی بجز اس کے کہ انداز بیان اور سلاست میں تھوڑی بہت جان پیدا کر دی ہے۔

غالب کے یہاں بھی سادہ تشبیہات و استعارات بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کو آرٹ سے فروتر سمجھتا تھا، اسی لئے اس نے اگر تشبیہات و استعارات سے کام لیا بھی تو ایسے انداز کے ساتھ کہ ان کی صورت شاعرانہ کی سی ہو گئی ہے جو تشبیہ و استعارہ سے مختلف ہے مثلاً:-

اے گرد راہ تو بہ جہاں نو بہار من،

جلوۂ طور بہ آرائش بزمش مشعل

ز موج گل بہاراں بستہ زنار

بہار بستر و فردوس آغوشش

تو گوئی موجے از دریائے نور ست

غبار رہش سیمیائے بہشت

ان مصرعوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی شاعری کا تمثیلی رنگ کس قدر لطیف و دلکش ہے۔ یہ رنگ سعدی کے یہاں خیر کم ہونا ہی چاہئے تھا کیوں کہ انھوں ہی نے اس کا آغاز کیا تھا لیکن حیرت تو یہ ہے کہ عرفی، نظیری، طالب آملی اور ابو طالب کلیم کے یہاں بھی بہت کم نظر آتا ہے۔ صائب نے البتہ اس تمثیلی انداز کو زیادہ کامیابی کے ساتھ اختیار کیا، لیکن اکثر جگہ تغزل سے دور ہے۔ مثلاً:-

ز شبنم است چمن دہروئے آتشناک   عرق ز روئے تو کردہ است گل بدامن پاک

بر تعلق ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست   پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

یادگار جگر سوختۂ مجنوں است   لالۂ چند کہ از دامن صحرا برخاست

ثنائے خود بخود گفتن نمی زیبد ترا صائب   چو زن پستان خود مالد حظوظ نفس کے یابد

لیکن جس جگہ وہ تغزل کے حدود میں رہ کر اس رنگ سے کام لیتا ہے زیادہ دلکش ہو جاتا ہے مثلاً:-

شب کہ صحبت بحدیثِ سر زلف تو گزشت   ہر کہ برخاست ز جا سلسلہ برپا برخاست

غالب کے یہاں یہ رنگ، جیسا کہ ہم نے ابھی ظاہر کیا بہت پاکیزہ و نادر ہے اور اس کا خاص سبب ہے۔ "حسن تعبیر" کا تعلق زبان سے اتنا نہیں ہے، جتنا "تخییل" سے اور چونکہ غالب نے "تخییل" میں مرزا عبدالقادر بیدل سے استفادہ کیا تھا جو اس رنگ کا بادشاہ تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ متقدمین میں سے کوئی اس کے مقابل نہ ٹھہر سکتا تھا۔ غالب کے جو مصرعے ہم نے سطور بالا میں نقل کئے ہیں، ان کی ترکیب سے بھی "بیدلانہ" رنگ ظاہر ہے، لیکن چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں:-

شانِ ماضی و گرانائی مستقبل

مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بالکل بیدل کی زبان ہے۔

نظارگی گلزار تا عیاں شوی

الفاظ و خیال دونوں بیدل کے ہیں۔

رنگ ستم شرارے می نویسم   کف خاکم غبارے می نویسم،

شرار نوشتن اور غبار نوشتن اس قسم کی جدتیں بیدل کی خصوصیات ہیں۔

کتانِ خویشتن می شویم ز مہتاب

مرا کردہ اند آشکارا ز من

در آفاق طرح پریخانہ ریخت

بہر ذرہ خورشید می ریختند

نفس ز خوئے تو گلدستہ بند رنگینی   نگہ ز روئے تو آئینہ دار حیرانی

خون گشتہ ایم و باغ و بہار خودیم ما

ہلاک جلوۂ برق شراب گاہ گاہی ما

بر سرم ز آزادی سایہ ہا گرانیہاست

بر خویشتن ز آبلہ چیزے فزودہ

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن   ز خود رفتیم و ہم خویشتن بردیم دنیا را

زاہد مناز چندیں زنارم ار گسستی   از جبہ ام نہ دزدد کس سجدۂ صنم را

ندانم تا چساں از عہدۂ دردش بر آئیم   ز شادی جاں بہا گفتم متاع کم بہائش را

تا چها آئینۂ حسرتِ دیدارِ توام — جلوہ برخود کن و ما را بنگاہے دریاب

زلکنت می تپد نبض رگ لعل گہر بارش — شہید انتظار جلوۂ خویش ست گفتارش

ان تمام مصرعوں اور شعروں کی ترکیبیں بیدل کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں اور اسی لئے غالب کا تمثیلی رنگ معنوی حیثیت سے
بہت گہرا نظر آتا ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ بیدل کے رنگ سے ہٹ کر اس نے تمثیلی شاعری کی ہی نہیں۔ اس
اس کی انفرادیت ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے :-

نازم فروغ بادہ، زعکس جمال دوست — گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

روئے محبوب کے عکس سے شراب کی تابش کا بڑھ جانا اور اس کی یہ تعبیر کرنا گویا پیالہ میں آفتاب نچوڑ کر رکھ دیا گیا ہے خاص
چیز ہے۔

سرگرمیٔ خیال تو از نالہ باز داشت — دل پارۂ آتشے ست کہ دودش نماندہ است

دل جو نالہ نہ کر سکے، اس کی مثال ایسی آگ سے دینا جو دھواں دینا چھوڑ چکی ہے، حسنِ تعبیر کی ایسی پاکیزہ مثال ہے کہ
سے اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے

جلوہ کن منت منہ، از ذرہ کمتر نیستم — حسن با ایں تابناکی آفتابے بیش نیست

جلوۂ محبوب کو تابشِ آفتاب سبھی نے کہا ہے، لیکن غالب نے اپنے اندازِ بیان سے اسی پامال مضمون کو خدا جانے کہاں سے کہاں
کہتا ہے :- "سامنے آئے اور آپ کا سامنے آنا مجھ پر کوئی احسان نہ ہوگا، کیونکہ آپ کی جلوہ نمائی زیادہ سے زیادہ
آفتاب ہی ہو سکتی ہے اور میں بہرحال ذرہ سے کم تو ہوں نہیں کہ اس کی تاب نہ لا سکوں"۔

زجوشِ دل بجوزش ریشۂ درآبست پنداری — بمژگاں قطرۂ خوں، غنچۂ "چیدہ را ماند

مژگاں پر آئے ہوئے قطرۂ خون کو ایسی کلی سے تشبیہ دینا جو ابھی توڑی نہ گئی ہو کتنا لطیف تصور ہے۔
اسی رنگ میں غالب کا ایک اور شعر سن لیجئے جو تمثیلی رنگ میں میرے نزدیک پورے دیوان کا حکم رکھتا ہے :-

شوخی شمیمش بیں، جنبشِ نسیمش بیں — غنچہ راست آہنگے، سرو راست رفتارے

شمیم کو "آہنگِ غنچہ" اور جنبشِ نسیم کو "رفتارِ سرو" سے تعبیر کرنا نزاکتِ تخیل و پاکیزگیٔ خیال کی حد ہے۔
اسی انداز کا ایک جملہ ملا قریشی نے باغ عباس آباد کی تعریف میں لکھا ہے :-

"صبح نسیمے ست از نسترن زارش گزشتہ ـــــ و شفق، ہوائے ست از لالہ زارش برگشتہ"

یعنی صبح، جس چیز کا نام ہے وہ در اصل بادِ نسیم کی وہ موج ہے جو اس باغ کے نسترن زار سے ہو کر نکل گئی ہے اور جسے شفق
وہ در حقیقت ہوا کا ایک جھونکا ہے جو اس کے لالہ زار سے چھو کر گزر گیا ہے۔

غالب کا ایک اور شعر اسی رنگ میں اس سے بہتر ہے :-

نازم بکلبہ کیست، نہ شمع و نہ آفتاب — بام و در م ز ذرہ و پروانہ پُر شدست

محبوب کو شمع و آفتاب سبھی نے کہا ہے، لیکن غالب نے پہلے مصرعہ میں جس "تجاہلِ عارفانہ" سے کام لیا ہے، اس نے اس
بالکل نیا رنگ بھر دیا۔

اس سلسلہ میں اُردو کا بھی ایک شعر اسی اندازِ بیان کا سن لیجئے :-

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں — وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اس سے قبل غالب کے جتنے اشعار ہم نے نقل کئے ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تمثیلی شاعری کتنی تابش و شگفتگی رکھتی
رنگ سعدی کے یہاں تو بالکل نظر نہیں آتا اور اگر چند اشعار ملتے بھی ہیں تو اس رنگ کے :-

دلِ سعدی ہمہ ز ایام بلا پرہیزد
سرِ زلفِ تو ندانم بچہ یارا بگرفت

خواجہ حافظ کے یہاں بھی یہ رنگ بہت کم ہے، البتہ عرفی و نظیری کے کلام میں اس کی کچھ مثالیں ملتی ہیں، لیکن کیفیت
کیفیت دونوں حیثیتوں سے غالب کے مقابلہ میں کم۔
نظیری کے دو شعر تمثیلی رنگ کے ملاحظہ ہوں :-

ہمہ شب برلب و رخسار و گیسوی زنم بوسہ — گل و نسرین و سنبل را صبا دور من ست امشب

محبت در دلِ غمدیدہ اُلفت بیشتر گیرد — چراغے را کہ دودے ہست در سر زود گیرد

تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ فارسی شاعری اور خصوصیت کے ساتھ غزل گوئی کو ترقی ایران میں نہیں
بلکہ ہندوستان میں ہوئی، صفوی خاندان کی وجہ سے نہیں بلکہ مغلیہ قدر دانیوں کی وجہ سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب
ایران کے تمام اہلِ کمال شعراء کھنچ کھنچ کر یہاں آرہے تھے اور ہر امیر کا دربار، ان کی غزل خوانیوں کا مرکز تھا۔ ایک دوسرے
بازی لیجانے اور زیادہ رسوخ حاصل کرنے کے لئے ہر شاعر پوری کاوش کام لے رہا تھا اور اسلوبِ بیان میں طرح طرح کی
جدتیں پیدا ہو رہی تھیں۔

سب سے بڑا دربار اکبر، جہانگیر و شاہجہاں کا تھا۔ اس لئے ہر شاعر کی دلی تمنا یہی تھی کہ وہ یہاں بار پاسکے اور جب اسے
کامیابی ہو جاتی تھی تو اسے دربار کے ملک الشعراء بننے کی خواہش ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کشاکش معمولی نہ تھی اور اس مسابقت میں
وہی شعراء حصہ لے سکتے تھے جو غیر معمولی فطانت و ذہانت کے مالک ہوں اور جو اپنے کلام سے بادشاہوں اور امیروں کو چونکا سکیں
چونکہ اکبر و جہانگیر دونوں کے دربار کے امراء خود بھی نہایت اچھا ذوقِ سخن رکھتے تھے اس لئے اُن سے وہی شاعر داد لے سکتا
ہو واقعی اس کا اہل ہو۔ الغرض فارسی شاعری کا بہترین دور عہدِ مغلیہ کا دور تھا اور اسی زمانہ کے مشہور شاعروں کے کلام کو
قرار دے کر ہم متاخرین کے کلام کے حسن و قبح پر حکم لگا سکتے ہیں۔

یوں تو اکبر و جہانگیر کے زمانہ میں ایران کے بہت سے شاعر یہاں آئے اور یہ نہ کچھ قدر سبھی کی ہوئی، لیکن جو عزت و شہرت عرفی
نظیری، طالب آملی، صائب اور ابوطالب کلیم کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو سکی اور جس وقت ہم ان حضرات کے کلام
کے ساتھ ساتھ غالب کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہی تمام خوبیاں جو عرفی و نظیری وغیرہ کے یہاں شاہانِ مغلیہ
انتہائی قدر دانی کے زمانہ میں پائی جاتی تھیں، غالب کے کلام میں کیونکر پیدا ہو گئیں، جبکہ قدر دانی کیسی، کوئی اس کی زبان سمجھنے والا
بھی یہاں موجود نہ تھا۔

تمام نقادانِ سخن کا متفقہ فیصلہ ہے کہ کلام کی خوبی کا تعلق صرف جدتِ ادا اور روانیٔ کلام سے ہے، یعنی ایک ہی خیال کو نئے

...یوں سے پیش کرتا اور ایسی زبان میں جو ہموار و مترنم ہو اور اس کے پڑھنے سے کسی قسم کا ثقل محسوس نہ ہو۔

سعدی کے زمانہ تک غزل میں جدت ادا اور باعتبار تعبیر کا رواج نہ ہوا تھا، بلکہ محض سادہ جذبات کو سادہ و شیریں زبان میں ...نا ہی غزل کہلاتا تھا لیکن سعدی نے سادگی بیان کے ساتھ معاملہ بندی، محاکات بے ندرت بیان سے بھی کام لیا، جس کو خسرو ...حافظ نے کافی ترقی دی اور پھر رفتہ رفتہ اس نے ایرانی شاعری کے آخری دور (یعنی عرفی و نظیری کے زمانہ میں) ایک مستقل ...کی حیثیت اختیار کرلی، اور حقیقت یہ ہے کہ غالب اسی رنگ کا بادشاہ تھا۔

فارسی کے مشاہیر غزلگو شعراء اور غالب

...دی — سعدی کے یہاں معاملہ بندی و جدت ادا کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

سعدیا تو بتے امشب دل صبح نکوفت   یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

دل و جانم بتو مشغول و نظر چپ و راست   تا نداند حریفاں کہ تو منظور منی

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم   باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

دنبال تو بودن گنہ از جانب ما نیست   با غمزہ بگو تا دل مردم نرباید

زمن مپرس کہ از دست او دلم چون ست   ازو بپرس کہ انگشتہاش پرخون ست

یقیناً ان تمام اشعار میں جدت ادا سے کام لیا گیا ہے، لیکن چونکہ سعدی کے زمانہ میں اس رنگ کا بالکل آغاز تھا، اس لحاظ ...کی حیثیت بھی سادہ نقوش سے زیادہ نہیں، البتہ جہاں کہیں عشق کی چاشنی شامل ہوگئی ہے وہاں سعدی کا یہ رنگ بھی ...تا ہے۔ مثلاً:۔

جاں در نظر و شوق ہمچناں باقی   گدا اگر ہمہ عالم بدو دہند گداست

مضمون نہایت معمولی ہے لیکن اسلوب بیان کی جدت اور لہجے کے جوش نے اس شعر کو آسمان پر پہنچا دیا۔

...رو — خسرو کا تغزل ہم کو اس لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ نظر آتا ہے کہ ان کے یہاں سوز و گداز تو سعدی کا سا ہے، لیکن ...ب بیان کی جدتیں ان کے یہاں بہ نسبت سعدی کے زیادہ دلنشیں و متنوع ہیں۔ مثلاً:۔

جاں ز نظارہ خراب و تاز و ناز اندازہ بیش   ما بہ بوئے مست و ساقی پُرد بہ پیمانہ دار

بتے و آفت تقوی و آخر ایں نمیدانی   کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

گفتم چگونہ: می کشی و زندہ می کنی   از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نکرد

می روی و گریہ می آید مرا   ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

...پہلے اور چوتھے شعر میں جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے، وہ سعدی سے ذرا مختلف اور نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

... — حافظ کے یہاں بھی ہم کو جدت ادا کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن کم اور وہ بھی خاص رنگ کی، مثلاً:۔

ہرکس کہ بدید چشم او گفت   کو محتسبے کہ مست گیرد

گر کند میل بہ خوباں دل من خردہ مگیر   کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

پروانہ و شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند   اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن

عرفی و نظیری — عہد مغلیہ کے زمانہ تک چونکہ زبان بہت ترقی کرگئی تھی اور نئے نئے اسلوب بیان کی اس میں کافی گنجائش پید... ہوگئی تھی، اس لئے اس عہد کے شعراء نے تغزل میں بہت ترقی کی اور خصوصیت کے ساتھ عرفی اور نظیری نے جدت ا... کی بڑی اچھی اچھی مثالیں پیش کیں۔

عرفی کے چند اشعار ابداع بیان کے ملاحظہ ہوں:۔

ساقی توئی و سادہ دلی ہیں کہ شیخ شہر   باور نمی کند کہ ملک می گسار شد

تمام بود بیک حرف گرم و افسل   حکایتے کہ بہ ہمہ ناتمام می گفتند

کلید میکدہ را بہ من دہید کہ من   بہ آں کسم کہ باندازہ مست می گردد

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمن حسن   بہ خوشہ چینی آئینہ کم نمی گردد

کمند کوتہ و بازوئے سست و بام بلند   بہ من حوالہ و نومیدیم گنہ گیرند

فارغ ز خیرگی مگرد روئے آفتاب   ایں دیدہ آزمودہ نظارہ کسے ست

آپ نے دیکھا کہ معمولی معمولی باتوں کو کیسے نئے نئے زاویہ سے پیش کیا ہے۔

نظیری کا ابداعی رنگ عرفی سے زیادہ دلچسپ تھا، کیونکہ اول تو وہ معاملہ حسن و عشق کی چاشنی کو کسی جگہ ہاتھ سے نہ جا... دیتا تھا اور دوسرے یہ کہ انداز بیان کی جدت کے ساتھ اس نے ترکیبیں بھی نئی نئی ایجاد کیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

از کف نمی دہد دل آساں ربودہ را   دیدیم زور بازوئے ناآزمودہ را

تا منفعل ز رنجش بیجا نبینمش   می آرم اعتراف گناہ نبودہ را

ان شعروں میں دل آساں ربودہ۔ بازوئے ناآزمودہ اور گناہ نبودہ، ایسی ترکیبیں ہیں جو سعدی کے عہد میں را... نہ تھیں اور مغلیہ عہد میں بھی ہر شاعر ان پر قادر نہ تھا۔

از یک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود   امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

مردم از شرمندگی، تا چند باہر ناکسے   مروت از دور نمایندہ و گویم "یار نیست"

ہماں عشق ست بر خود بستہ چندیں داستاں ورنہ   کسے بیچی یک حرف صد دفتر نمی سازد

من نخواہم رفت اما بہر تسکین دلش   ہر کجا بنشیند، گوئیدش کہ فردا می رود

مجلس چو برشکست تماشا بما رسید   در بزم چوں نماند کسے، جا بما رسید

گرچہ میدانم قسم خوردن بجانت خوب نیست   ہم بجان تو کہ یادم نیست سوگند دگر

نظیری کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلوب بیان میں جدت و ابداع کا اسے خاص سلیقہ حاصل تھا اور اگر ہم عرفی... قصاید کو نظر انداز کردیں، جن میں اس نے جدت ادا کی بڑی بڑی عجیب مثالیں پیش کی ہیں، تو اس باب میں نظیری کی فوقیت تسلیم کرنا پڑے گا۔

آملی —— یہ دربار جہانگیر کا ملک الشعراء تھا اور نہایت ذہین شخص تھا۔ اس کی شاعری بھی ندرت بیان و لطف استعارات
لیکن اس کی یہ قوت زیادہ تر قصاید میں صرف ہوئی۔ تغزل میں اس کی جدت بیان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی — دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد
زغارت چمنت بر بہار منتہا ست — کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند
دو لب خواہم یکے در مے پرستی — یکے در عذر خواہیہائے مستی
باصد کرشمہ آں بت بدست می رود — خود می کند خرام و خود از دست می رود

کلیم —— یہ عہد شاہجہانی کا ملک الشعراء تھا، اور تغزل میں صائب کی خیال آفرینی کا متبع۔ جدت ادا کی مثالیں
کے یہاں بھی ملتی ہیں، لیکن نظیری و عرفی سے کمتر و فروتر مثلاً:۔

شعلہ برمی خواست از بے طاقتی دل می نشست — من نہ جنبیدم ز جا تا جا بہ گلشن داشتم
وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست — رو پس نکرد ہر کہ ازیں خاکداں گزشت
دارم رہے بہ پیش کز انگشت خار ہا — از من حساب آبلۂ پا گرفتہ است

—— آپ نے سعدی، خسرو، حافظ، عرفی، نظیری، طالب آملی، صائب اور ابوطالب کلیم کی جدت بیان و ندرت
مثالیں ملاحظہ فرمالیں، اب غالب کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔
غالب کے کلیات فارسی میں قصاید، مثنوی، قطعات اور غزلیں سبھی کچھ موجود ہیں، اور ان میں سے کوئی صنف سخن ایسی نہیں
اس نے جدت ادا و شوخی بیان سے کام نہ لیا ہو۔ چونکہ اس وقت موضوع بحث صرف غزل گوئی سے ہے اس لئے ہم اسی کو
رکھ کر چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔
ابتدائی صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ سعدی کا سادہ درد عشق تو غالب کیا کسی شاعر میں نہ پایا جاتا تھا اور تغزل کا وہ رنگ
کی ہوک کہنا چاہئے سعدی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ یہاں تک کہ خسرو بھی کوئی شعر ایسا نہ کہہ سکے جسے سعدی کے ان شعروں کے مقابلہ
کیا جا سکے:۔

اے ساربان آہستہ راں کارام جانم می رود

اے تماشا گاہ عالم روئے تو — تو کجا بہر تماشا می روی
دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست — تا نہ پنداری کہ تنہا می روی
لازم ست احتمال چندیں درد — کہ محبت ہزار چندیں ست

اس رنگ سے ہٹ کر بیان و زبان کے لحاظ سے تغزل کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ سب غالب کے کلام میں پائی
یں۔
خاص جذبات نگاری کی مثالیں کلام غالب سے ابتدائی صفحات میں دے چکے ہیں، اب تغزل و شاعری کے دوسرے
ں کو ملاحظہ فرمائیے جن پر تمام اساتذۂ ایران کی شہرت کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ یہ دوسرے محاسن کیا ہیں۔ "جدت بیان"
بداع اسلوب"۔

"جدت بیان" کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو ہمارے ذہن و تصور کو چونکا دیتی ہے وہ "معنی آفرینی" ہے یعنی بیان بھی
نیا اور تخییل بھی نئی، اس کے بعد مرتبہ ہے اُس "جدت بیان" کا جس میں خیال تو نیا نہیں، لیکن "پیرایۂ ادا" سے اس میں ندرت
پیدا کی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ زیادہ مشکل ہے۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ ہر نئی تخییل اپنے ساتھ نئی زبان بھی لاتی ہے اور نیا انداز بیان
بھی خود اسی سے پیدا ہوتا ہے، لیکن کسی پامال مضمون کو کسی ایسے طریقہ سے پیش کرنا کہ اس کی کہنگی دور ہو جائے اور پڑھنے والوں کو
نیا معلوم ہو، نہایت لطیف ذوق، نہایت پاکیزہ فکر اور حد درجہ ذہانت چاہتا ہے اور اسی کے ساتھ زبان کی غیر معمولی مہارت
بھی، کیونکہ اگر بیان میں سلاست و رواق نہ ہو، تو معنی آفرینی اور جدت بیان دونوں بیکار ہیں اور غالب کے کلام میں یہ تمام باتیں
تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

غالب کی معنی آفرینی

اگر غالب کی اور تمام خصوصیات کو نظر انداز کر کے صرف اسی ایک خصوصیت کو سامنے رکھا جائے تو بھی اس کے باکمال غزل گو ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ محض معنی آفرینی یقیناً کوئی وقعت نہیں
رکھتی، اگر وہ کسی ذہین مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہے، لیکن ایک باکمال شاعر کی معنی آفرینی باوجود نزاکت تخییل کے نہ فطری حدود سے
آگے بڑھتی ہے اور نہ زبان و بیان کے لحاظ سے بار سماعت ہوتی ہے بلکہ وہ فلسفہ ایسے خشک مباحث میں بھی رنگینی پیدا کر کے
غزل کے حدود میں لے آتی ہے۔
عرفی کا مشہور شعر ہے:۔

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحون عشق — موج دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست

شعر کا مطلب یہ ہے کہ۔ عشق کے جیحون (ایک نہر یا ندی کا نام ہے) میں یہ ضرورت ہے کہ انسان سمندر (ایک کیڑا جسکے
متعلق مشہور ہے کہ آگ سے پیدا ہوتا ہے اور آگ ہی میں رہتا ہے) بھی بنا رہے اور مچھلی بھی، کیونکہ اس دریا کی موج (یعنی بالائی
سطح) سلسبیل (جنت کے ایک چشمہ کا نام) ہے اور اس کی گہرائی آگ!
مدعا یہ کہ اگر کوئی شخص عشق کی ابتدا و انتہا دونوں سے جان سلامت لے آنا چاہتا ہے تو اس کو سمندر اور ماہی دونوں ہونا
چاہئے تاکہ جب تک سطح پر ہے تیرتا رہے اور جب تہ میں پہونچ جائے تو وہاں کی گرمی سے متاثر نہ ہو۔
بظاہر یہ شعر معنی آفرینی کی اچھی مثال نظر آتا ہے، لیکن ایک نقاد کو اس میں کئی نقص نظر آئیں گے۔ سب سے پہلا نقص تو انتخاب
الفاظ کا ہے۔ پہلے مصرع میں شاعر نے جیحون کا لفظ استعمال کیا ہے جو ایک رود بار کا نام ہے اور مجازاً دریا کے مفہوم میں بھی
استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اسی کو وہ ایک سلسبیل کہتا ہے اور دوسری جگہ دریا، حالانکہ یہ تینوں چیزیں علیحدہ علیحدہ
حیثیت رکھتی ہیں۔
دوسرا معنوی نقص یہ ہے کہ مصرعۂ ثانی میں سلسبیل کا لفظ جیحون کے مقابلہ میں تنزل درجہ رکھتا ہے، اگر سلسبیل سے مراد محض
چشمۂ جاری ہو تو بھی وہ ایسی چیز نہیں جس میں سوا مچھلی کے کوئی اور شناوری نہ کر سکے۔ مصرعۂ ثانی کے دوسرے ٹکڑے میں جو منظر
پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً سمندر کے لئے موزوں ہے، لیکن پہلے ٹکڑے میں سلسبیل کا لفظ منظر کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں
کرتا جو صرف ماہی کے لئے موزوں ہو۔
سلسبیل کے مفہوم کی روایتی شگفتگی و مسرت اس کی مقتضی نہ تھی کہ اُسے کسی مصیبت کے اظہار کے لئے استعمال

… علاوہ ان نقایص کے خود مفہوم میں بھی کوئی جدت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مچھلی ہمیشہ پانی میں تیرتی ہے اور سمندر آگ …
…تا ہے۔

…میں سمجھتا ہوں کہ غالب نے انھیں نقایص کو سامنے رکھ کر عرفی کے اس شعر میں یوں تصرف کیا ہے:-

در بلا بودن بہ از بیم بلاست ، قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست

…یعنی کسی مصیبت میں پڑ جانا، اس مصیبت کے خوف سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس کا ثبوت اس نے دوسرے مصرع میں یہ دیا
… جب تک انسان دریا کی سطح پر ڈوبنے سے بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، پریشان رہتا ہے، لیکن جب وہ ڈوب کر دریا
…ک پہونچتا ہے تو ساری مصیبت دور ہو جاتی ہے۔ گویا سطح آب اس کے لئے آگ تھی اور قعرِ دریا سلسبیل بن گیا۔
…آپ نے دیکھا کہ غالب نے سلسبیل کا کتنا صحیح استعمال کیا ہے اور معنی آفرینی تو خیر ظاہر ہے۔
…غالب کی اس خصوصیت کی چند مثالیں اور ملاحظہ فرمایئے:-

از گدازِ یک جہاں ہستی صبوحی کردہ ایم ، آفتابِ صبحِ محشر ساغرِ سرشار ما

…محشر کا منظر بہت جانگداز ہے۔ لیکن غالب کے لئے تو آفتابِ حشر بھی ساغرِ سرشار کا حکم رکھتا ہے۔ اگر یہ بات اسی جگہ ختم ہو جاتی
…شعر معمولی تھا کیونکہ آفتاب کو بھی نے ساغر کہا ہے، لیکن پہلے مصرع نے مفہوم کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ چونکہ آفتابِ حشر کے
…مشہور ہے کہ وہ سوا نیزہ پر آجائے گا اور لوگوں کا دماغ تک پگھلنے لگے گا، اس لئے اسے "گدازِ یک جہاں ہستی" سے تعبیر
…شاعر کا کام نہ تھا۔ اب معنوی خوبی دیکھئے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص "گدازِ یک جہاں ہستی" سے صبوحی کرے گا، خود اس کے
…گداز کی شدت کا کیا عالم ہوگا۔ اس لئے آفتابِ محشر کو ساغرِ سرشار قرار دینے کا ثبوت بھی دے دیا کیونکہ جو شخص اتنا سوز و گداز
…ے گا وہ یقیناً خوفِ محشر سے بے نیاز ہوگا۔

گرفتہ خاطر از اسباب و سرخوشی باقی ست ، ترانۂ کہ نگنجد بہ ساز می خواہم

…یعنی مسرت و شادمانی کے جتنے اسباب ہو سکتے ہیں اُن سب سے دل ہٹ گیا ہے، کیونکہ وہ ناکافی ہیں اور ولولۂ نشاط پورا
…تا۔ اس حد تک تو خیر ایک ایسی بات تھی جس کا احساس ہر ذی حس انسان کو ہو سکتا ہے، لیکن اس کیفیت کا اظہار اس
…اسلوب سے کرنا کہ "یہ کیفیت گویا ایک ایسا ترانہ ہے جو ساز میں بھی نہیں سما سکتا" معمولی شاعر کا کام نہ تھا۔
…معنی آفرینی اس میں شک نہیں کہ معمولی ذہانت کے انسان کا کام نہیں، لیکن اکثر و بیشتر اس راہ میں شعراء بھٹک جاتے ہیں
…"…لطفِ تخییل" کا غلو ابہام نویسی کی طرف لے جاتا ہے، لیکن غالب کی غزلوں میں آپ کو کوئی تخییل ایسی نہ ملے گی جس کا پس منظر
…حسن کی دنیا سے علٰحدہ ہو اور اسی لئے اس کی نکتہ آفرینیاں زیادہ تر جدتِ ادا، حُسنِ تعبیر، ابداعِ بیان، جوشِ و
…کی صورت میں نظر آتی ہیں اور اپنے حُسن کے ساتھ کہ حد سے زیادہ مبالغہ کی حالت میں بھی، وجدان اس سے
… اُٹھاتا ہے۔
…اس کا ایک شعر ہے:-

اے کہ اندریں وادی مژدہ از ہما دادی ، بر سرم ز آزادی سایہ گر انیہاست

…مجھے اس وادی یعنی اس زندگی میں ہما کے آنے اور میرے سر پر سایہ فگن ہونے کی خوشخبری کیا سناتے ہو، میں تو وہ

آزاد انسان ہوں کہ اپنے سر پر سایہ کے بوجھ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔
فرطِ ناتوانی و نزاکت سے سایہ کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکنا، ممکن ہے کسی اور نے بھی لکھا ہو لیکن اس کو آزادی کے منافی بتا…
ایسی غیر معمولی جدتِ فکر ہے جس کی مثالیں آپ کو شاذ و نادر ہی کہیں مل سکتی ہیں۔ کسی کے احسان کو گوارا نہ کر سکنے کا خیال…
اس سے زیادہ خوبصورت، نازک اور موثر انداز میں میری نگاہ سے کہیں نہیں گزرا۔ اسی قسم کی ایک دلکش شاعرانہ تعلی کی…
دوسری مثال ملاحظہ ہو:-

شنیدہ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم ، ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

شاعری کی دنیا میں موسیٰ اور یوسف کا ذکر بہت پایا جاتا ہے، لیکن ابراہیم کے واقعات میں شاعروں کو کوئی بات ایسی…
نہ آئی تھی کہ انھیں وہ اپنے طنز و طعن کا ہدف بنا سکتے، لیکن غالب نے ایک نکتہ پیدا کر ہی لیا اور وہ بھی اس قدر دل آویز کہ صرف وہ…
ہی اس کا پورا لطف اُٹھا سکتا ہے۔
اسی زمین کے دو شعر اور سنئے:-

مراد میدنِ گل ور گماں فگند امروز ، کہ باز بر سرِ شاخِ گل آشیانم سوخت

کھلے ہوئے پھول کو دیکھ کر یہ سمجھنا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ آشیانہ جل رہا ہو، صرف غالب ہی کے سمجھنے اور کہنے کی بات تھی۔

نوید آمدنت رنگ از قفا دارد ، شگفتہ روئیِ گلہائے بوستانم سوخت

غالب صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ پھولوں کی شگفتگی محبوب کے حُسن کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی، لیکن اس خیال کے اظہار…
لئے جو پیرایۂ بیان اس نے اختیار کیا ہے وہ "جدتِ ادا" کی آخری حد ہے۔

خمریاتِ غالب

شراب و متعلقاتِ شراب پر گفتگو، کا خاص موضوع ہے اور اس سلسلہ میں بڑی لطیف طرزِ بیان…
سے کام لیا گیا ہے، مثلاً:-

پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا منہ ، در شریعت بادۂ امروز آب و فردا آتش ست

اہلِ شریعت کا بیان ہے کہ دُنیا میں جس چیز کو لوگ شراب کہہ کر پیتے ہیں وہی کل (قیامت کے دن) آگ بن جائے گی، غالب…
کہتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو کیوں نہ ہم آج اتنی پئیں کہ کل کے لئے باقی ہی نہ رہے۔ نہ باقی رہے گی نہ آگ بنے گی۔

راہ بے زنگی دیرینہ بہ مینو کشادہ ایم ، از خم کشیم بادہ و در کوثر افگنیم

ہم خرابات کو تم گنہگار، دوزخی نہ سمجھو، خرابات سے بہشت جانے کی بھی ایک راہ ہم نے پیدا کر لی ہے، اس لئے ہمارا شراب پینا…
خم سے شراب لے کر کوثر میں اس کا ذخیرہ جمع کرنا ہے تاکہ مرنے کے بعد اس سے لطف اٹھائیں۔
غالب کا مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ اگر جام کوثر "جامِ شراب" نہیں تو بیکار ہے، لیکن اس کے لئے پیرایۂ بیان کتنا…
اختیار کیا:-

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشم کم مبیں ، بے نمیدانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

زاہد سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگر میں نے تم کو انگور کا خوشہ تحفہ میں دے دیا تو اسے کم نہ سمجھو، کیونکہ اس طرح میں نے تمھارے…
پورے ایک جام شراب کا نقصان گوارا کر لیا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

شراب کے سلسلہ میں شوخی بیان کی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں:-

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند — جز روزۂ درست ز صہبا کشودہ

قیامت کے دن میری شرمندگی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ سوا اُس ایک روزہ کے جو میں نے شراب سے کھولا کوئی اچھا کام میرے اعمالنامہ میں نظر ہی نہ آیا۔

شوخی بیان تو خیر ظاہر ہے، لیکن اسی کے ساتھ در پردہ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ مجھے دُنیا میں کتنی کم شراب میسر آئی!۔

"خمریات" کی شاعری میں میخواری کی شدت ظاہر کرنے کے لئے شاعروں نے تو اکثر یہ کہا ہے کہ:-

ما دُردی کشِ میخانہ ایم

یعنی ہم شراب کی تلچھٹ تک پی جاتے ہیں، لیکن غالب کی بدمستی رندی کا عالم ہی کچھ اور ہے وہ کہتا ہے:-

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر — بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

خمریات کے سلسلہ میں شوخ بیانی کی ایسی مثالیں کلام غالب میں بہت مل سکتی ہیں، لیکن ان سے بہتر غالب کے وہ اشعار ہیں جن میں بجائے شوخی کے صرف کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے، جن میں مستی و بیخودی کا ذکر مستی و بیخودی کے عالم میں کیا گیا ہے مثلاً:-

مستم ز خونِ دل کہ دو چشمم ازاں پُرست — گوئی نخوردہ شراب و ندانی بجام چیست
جنوں مستم بفصل نوبہارم می تواں گشتن — صراحی برکف و گل در کنارم می تواں گفتن
شیوۂ رندان بے پروا خرام از من مپرس — اینقدر دانم کہ دشوارست آساں زیستن
چو بوسہ گل جنوں تازیم از مستی چہ می پرسی — شکستن دارد از صد جا عنانِ اختیار ما
بوسہ از لبانم دہ، عمر خضر از من مخواہ — جامے ز چشم بدہ، عشرت جم از من مپرس
بادہ مشکبوئے ما، بید و کنار کشت ما — کوثر و سلسبیل ما، طوبیٰ ما بہشت ما

کہتے ہیں کہ ہم سے شراب پلانے کا وعدہ حشر میں کیا گیا ہے اور ممکن ہے وعدہ کرنے والا شاید یہ سوچتا ہو گا کہ یہ وعدہ ہم کو گراں گزرے گا۔ اور ہم اس طول مدت سے گھبرا جائیں گے۔ مگر ہم کو اس سے اور زیادہ خوشی ہے اس لئے کہ شراب پرانی ہوتی جاتی ہے۔ وہ اور بھی لطیف ہوتی جاتی ہے:-

گفتی زے بحشر و نجم ازیں درنگ — مستی دہد زیادہ چو صہبا کہن شود

ایک جگہ کہتے ہیں کہ عید کا دن ہے خوشحالی اور سرور و خرمی کا دور دورہ ہے۔ پی اور خوب جی بھر کے پی۔ اگر یہ گناہ ہے تو میں اس کا ذمہ دار ہوں:-

عیدست و نشاط و طرب و زمزمہ عام است — مے نوش گنہ بر من اگر بادہ حرام است

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ شراب بھی کیا کوئی روزہ ہے جو آج کے دن حرام ہے:-

عید است و صلائے خور و نوش است جہاں را — مے روزہ نباشد کہ دریں روزہ حرام است

ساقی سے کہتے ہیں کہ یہ تو تجھ کو معلوم ہی ہے کہ شراب اندازہ سے پینا حرام ہے۔ بے اندازہ حلال ہے اس کی ترکیب یہ ہے کہ تو اپنا شیشہ ہمارے پیمانہ پر پٹک دے:-

مے باندازہ حرام آمدہ ساقی ورنہ — شیشۂ خود بشکن بر سر پیمانۂ ما

ایک جگہ کہتے ہیں کہ جتنی ہو بس اُس کو آج ہی چڑھا جاؤ، اور یاد رکھو کہ شریعت تم کو یہی خبر دیتی ہے کہ شراب آج پانی مگر کل یہ آگ ہو جائے گی:-

پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا منہ — در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اس جنگ و جدل کو چھوڑ کر کہاں کے فضول جھگڑوں میں پڑا ہے۔ میخانہ کی باتیں کر کیونکہ وہاں نہ جنگ جمل کی باتیں ہوتی ہیں اور نہ کوئی فدک کا جھگڑا لے کر بیٹھتا ہے:-

بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں — کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ شراب پی اور خدا کے کرم پر بھروسہ رکھ کیونکہ خط پیالہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کتنی پینی چاہئے، کب پینی چاہئے کیونکر پینی چاہئے مطلب صرف پینے سے ہے پئے جا:

مے نوش و تکیہ بر کرم کردگار کن — خط پیالہ را رقم چون و چند نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ غالب، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ برسات صرف ان تین باتوں کے لئے آتی ہے اور اس موسم کے کرنے کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ خوب چڑھ جائے۔ آم کھائے اور برف کا پانی پئے:-

غالب من و خدا کہ سرانجام برشگال — غیر از شراب و انبہ و برفاب و قند نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ابر کرم کا مشغلہ بس اتنا ہی ہے کہ جن لوگوں کے خرقے پر شراب کے داغ ہوں انھیں دھویا کرے:

شستن دخوشمشغلہ شوخی ابر کرم است — وزم آں خرقہ کہ با داغ نیا سودن رفت

معشوق کو ہدایت کرتے ہیں کہ روزہ کے مہینے میں زلفیں کھولے ہوئے تو پریشان ہو کر کیوں پھر رہا ہے۔ مزہ کر شراب پی۔ کہ زمانہ میں تیری زلفیں پریشان ہونے کی وجہ سے یا تیرا چاند سا چہرہ دیکھنے سے عید کی چاند رات ہو رہی ہے:-

در ماہ روزہ طرہ پریشاں چہ می روی — مے خور کہ در زمانۂ شب عید بودہ است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ بھئی اب ہم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اتنی دور جائیں اور شراب کا گھڑا لے کر واپس آئیں۔ ہمارا مکان بس میخانہ کے قریب ہی بننا چاہئے تھا:-

برنتابم بسکہ بادہ ز دور آوردن — خانۂ من بسر کوئے مغاں می بایست

ایک جگہ یوں منادی کرتے ہیں کہ بھائیو ولایتی شراب آگئی ہے اور بہت سستی ہو گئی ہے۔ اور دین کے عوض ایک گھونٹ ملتی ہے۔ خریدو، دوڑو، دیکھو بہت سستی ہے شاید پھر نہ ملے:-

از فرنگ آمدہ در شہر فراواں شدہ است — جرعہ را دین عوض آمدہ ارزاں شدہ است

آپ کعبہ میں ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں، کہ ہے کوئی خدا کا ایسا نیک بندہ جو کعبہ میں ہمیں شراب کا ایک پیالہ پلائے۔ خدا کے لئے اگر ضرورت ہو تو ہم جامۂ احرام گرو رکھ سکتے ہیں:-

کیست در کعبہ کہ رطلے ز نبیذم بخشد — در گرو گاں طلبد در جامۂ احرامی ہست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے، کہ بغدادی کون ہے اور بسطامی کون ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ معشوق ہمارے آگے

...ب لندن سے :-

مے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار   ما ندانیم کہ بغدادی و بسطامی ہست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ خلوت میں جو روزانہ دوست کے ساتھ شراب پیتا رہتا ہے۔ وہ اچھی طرح حور اور کوثر اور بہشت کی حقیقت ...ہے :-

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام   داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

اسی غزل میں کہتے ہیں، آج کل میاں غالب شراب کا نرخ دریافت کرتے پھرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، مصحف اور ...میں بک گیا ہے :-

از کاسۂ کرام نصیب است خاک را   تا از فلک نصیبۂ کاسِ کرام چیست

غالب اگر خرقہ و مصحف بہم فروخت   پرسد چرا کہ نرخ مے لالہ فام چیست

کہتے ہیں کہ غالب جو بہشت میں گیا داروغۂ بہشت نے شیر و شہد سے تواضع کی، اس غریب نے بہا معاف فرمایئے ...و شراب چاہئے :-

رضواں چو شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد   بیچارہ باز داد و مے مشکبو گرفت

کہتے ہیں شراب سب کو ایک ہی سبو سے ملتی ہے۔ مگر قسمیں سب کی الگ ہیں۔ جمشید جام جم میں پیتا ہے۔ اور ...پی تو بنی میں :-

از یک سبو است بادہ و قسمت جدا جداست   جمشید جام بُرد و قلندر کدو گرفت

ایک جگہ کہتے کہ ہندوستان کی بہار برسات ہے۔ خیر خدا کا شکر ہے یہاں بھی شراب پینے کا ایک موسم ہے :-

بہار ہند بود برشگال ہاں غالب   دریں خزاں کدہ ہم موسم شرابے ہست

کہتے ہیں کہ شراب سے جو منع کرتے ہیں ________ اس کی وجہ یہ ہے کہ دروغ مصلحت آمیز بولنا دستی ...یر۔ اور یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر اس میں آیا ہے اس قدر بلیغ ہے کہ سیکڑوں ظرافت آمیز معنی اس میں پیدا ہو سکتے ہیں

بادہ نے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند   آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

کہتے ہیں کہ معلوم مجھے لوگ شراب پینے سے کیوں روکتے ہیں۔ میں کوئی محدث اور فقیہ تو ہوں نہیں کہ میری ثقاہت ...نقصان پہونچ جائے گی۔ میں تو شاعر ہوں، شاعر کو شراب سے کیا نقصان پہونچ سکتا ہے :-

بادہ گر بود حسیل، شاعرم نہ فقیہ   سخن چہ ننگ ز آلودہ دامنی دارد

اسی غزل میں کہتے ہیں کہ ہم میکدے میں آتے ہیں تو ساقی بچھا جاتا ہے۔ ہم اپنے جی میں خوش ہیں کہ ہماری بڑی تعظیم ہو رہی ہے ...واقعہ یہ ہے کہ شراب رہی نہیں ہے ساقی صرف اس بزرگ داشت پر ہم کو ٹالنا چاہتا ہے :-

خوشم بہ بزم ز اکرام خویش و زیں غافل   کہ مے نماندہ و ساقی فروتنی دارد

کہتے ہیں کہ یہ بے مغز واعظ کہتے ہیں کہ جنت میں حوریں ہیں، کوثر ہے کیونکہ اسی کی خبر دی گئی ہے، اور احمق یہ نہیں سمجھتے ...ور و کوثر فقط ایک استعارہ ہے شراب و شاہد کا کھلم کھلا نام لینا منع ہے۔ ان کو صرف یہ نام لے کر کلام میں کھپا دیئے، ورنہ

مطلب وہی شراب و شاہد ہے :-

گفتند حور و کوثر و دادند ذوق کار   منع است نام شاہد و مے آشکار بود

کہتے ہیں کہ میں تو توبہ کرکے مسجد میں آگیا تھا، اپنے ذوق عبادت میں مصروف تھا، ساقی آیا اور اگر مجھے ... کر کیا تسبیح لے کے بیٹھا ہے۔ آجکل شراب خانہ میں طرح طرح کی شرابیں آئی ہیں۔ بس یہ سن کے میرے منہ میں پانی بھر آیا اور تسبیح ... مصلےٰ چھوڑ کر پھر میں میخانہ میں آگیا۔ اب جو یہاں آکے دیکھا تو یہ سب فریب تھا۔ یہاں ایک دو ساغر سے زیادہ موجود نہیں ہے ...

ساقی دگرم برد بہ خانہ ز مسجد   مے یک دو قدح بود و فریبم بہ سبو داد

واعظ سے کہتے ہیں۔ کہ ہمیں تو صرف شراب کا ایک مٹکا بھر کے بھیج دے باقی پھر تو چاہے جتنے دودھ کے دریا بہا... ہیں اور پرہیزگاروں کو فریب دے جا :-

خمے از مے بہ ما بفرست و انگہ ہر قدر خواہی   رواں کن جوئے از شیر و دل از پرہیزگاراں بر

کہتے ہیں کہ روزہ داروں کے اوپر بڑا رحم آتا ہے عید کے دن بھی غریب شیر و خرما میں مست ہیں بھلا اس شیر و خرما میں شراب... کا لطف کہاں۔ یعنی خدا کے لئے کوئی بیچاروں کو ہمارے نشاط میں سے تھوڑا سا حصہ پہونچا دو :-

ندارد شیر و خرما ذوق صہبا رحم مے آید   نشاط عید از ما چو سوئے روزہ داراں بر

کہتے ہیں کہ کیا کہنا ہے کوثر اور کوثر کی شراب مقدس کا۔ مگر ہمارے خمار میں وہ کام نہیں آسکتی

خوش است کوثر و پاک است بادہ کز در دوست   ازاں رحیق مقدس دریں خمار چہ حظ

کہتے ہیں کہ سنو بھی غالب خیر یہ تو منظور ہے کہ ہم تم کو میخانہ کے پاس ہی کہیں رہنے کے لئے جگہ دے دیں مگر شر... یہ ہے کہ صرف سونگھنے پر قناعت کیجئے پینے کو نہیں ملے گی :-

ترا بہ پہلوئے میخانہ جا دہیم غالب   بشرط آنکہ قناعت کنی ببوئے رحیق

کہتے ہیں کہ دوزخ اور کوثر میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے، ایک زمانہ تھا کہ میرے سینہ میں بھی ایسی ہی آگ تھی... اور میرے ساغر میں بھی ایسا ہی پانی تھا :-

تا چہ تنجم دوزخ و کوثر کہ من نیز ایں چنیں   آتشے در سینہ و آبے بہ ساغر داشتم

کہتے ہیں کہ ہم ذمی ہیں۔ یعنی وہ کافر ہیں کہ جنہیں بادشاہ نے پناہ دی ہے، بڑی خوشی کی بات ہے اب اگر ہم رمضا... مہینہ میں بازار میں بیٹھ کر پئیں تو بھی ہمارا کچھ نہیں کرسکتا۔

من کافر نہادی شاہم بہ من ارزد   مے در رمضاں بہ سر بازار کشیدن

کہتے ہیں کہ جنت مل بھی گئی تو کیا لطف اور وہاں شراب بھی ملی تو کیا نتیجہ۔ نہ تو بادۂ طہور میں محتسب کا غم اور نہ ... میں اندیشۂ زوال۔ پھر وہ شراب کس کام کی۔ اور اس عیش کا کیا مزا :-

در بادۂ طہور غم محتسب کجا   در عیش خلد لذت بیم زوال کو

کہتے ہیں کہ حشر میں میری حسنات کا جائزہ لیا گیا تو سوائے ان روزوں کے جو شراب سے کھولے گئے تھے ایک نیکی بھی نہ ملی :-

نجات نگر کہ در حسناتم نیافتند   جز روزۂ درست ز صہبا کشودہ

...ایک جگہ کہتے ہیں کہ غالبؔ چاندنی رات ہے، شراب پیو مانا کہ رمضان ہے۔ لیکن شب ماہ بھی تو ہے اور لطف بادہ نوشی چاندنی ... ہے:-

غالبؔ سرِ خم بکشا پیمانہ بہ مے در زن   آخر نہ شبِ ماہست گیرم رمضانستے

...ب کی شوخ نگاری

غالبؔ کی وہ خصوصیت جس میں اس کا کوئی ہمسر نہ ایران نے پیدا کیا نہ ہندوستان نے، اس کی شوخ نگاری ہے۔ شوخ نگاری عہد مغلیہ کے تمام شعراء کی خصوصیت تھی اور ایسا ہونا چاہئے ...ونکہ اس وقت ہر شاعر اپنے تفوق کے لئے انتہائی جد و جہد میں مصروف تھا اور اس سلسلہ میں ایک دوسرے پر طعن ضروری ... اس ضرورت نے لٹریچر میں "طنزیات" کے نئے باب کا اضافہ کر دیا اور رفتہ رفتہ قطعات و قصائد کے علاوہ غزلوں میں بھی اس کا ... ہو گیا، لیکن ذرا ہلکا اور اس کا نام شوخ نگاری ہے۔

...غزلوں میں شوخ نگاری کا ہدف زیادہ تر شیخ و زاہد کو قرار دیا جاتا ہے، لیکن یہ انداز بیان وسیع ہو کر بعد میں معاملات حسن و ... حاوی ہو گیا اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ غالبؔ کی شوخ نگاری میں جتنی جدت و دلکشی پائی جاتی ہے وہ مشکل ہی سے کہیں اور ... ملتی ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

خاموشی ما گشت بد آموز بتاں را   زیں پیش وگرنہ اثرے بود فغاں را

بر طاعتیان فرخ و بر عشرتیان سہل   نازم شب آدینہ و ماہ رمضاں را

بے گناہم پیر دیر، از من مرنج   من بہ مستی بستہ ام احرام را

جنت چہ کند چارۂ افسردگی دل   تعمیر باندازۂ ویرانی ما نیست

رواں فدائے تو نامم کہ بردۂ نامح   زہے لطافتِ ذوقے کہ در بیان تو نیست

مے بہ زاہد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب   پیش ایں قوم بہ شوربائے زمزم نہ رسد

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر   خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

زمن حذر نہ کنی گر لباس دیں دارم   نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

مرزا کی شوخ نگاری کی بعض اور پاکیزہ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار   ساقی و مغنی و شرابے و سرودے

زنہار از آں قوم نباشی کہ فریبند   حق را بہ سجودے و نبی را بدرودے

لاتقربوا الصلوٰۃ، زنہیم بخاطرست   وز امر یاد مانده کلوا واشربوا مرا

حال من از غیری پرسی و منت می برم   آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حال ما

اس میں لفظ آگہی کی تکرار نے بڑی لطیف شوخی پیدا کر دی ہے۔

زما گسستی و با دیگراں گرو بستی   بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا

جب تم یہ کہتے ہو کہ عہد وفا کا کیا اعتبار، تو پھر کیا پس و پیش ہے، اغیار سے عہد وفا توڑ کر پھر میرے پاس آجاؤ۔

گر بس از جور بہ انصاف گرایند چہ عجب   از حیا روئے بما گر ننماید چہ عجب

حالانکہ جب یہ شرما کر منہ چھپا لینا خود بڑا جور ہے اور غالباً اسی لئے وہ تلافی ستم پر آمادہ ہوا ہے کہ مجھ پر اور زیادہ جور ہوگا...

یاد از عدو ندارم و اینم ز دوربینی ست   کاندر گزشتن، با دوست ہمنشینی ست

اگر میں عدو کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ مبادا اسے دوست کی ہمنشینی حاصل ہو جائے کیونکہ ... دل میں تو دوست کے سوا کچھ نہیں۔

من سوئے او بہ بینم و اندازہ بے حیائی ست   او سوئے من نہ بیند و آں نام شرمگینی ست

کس قدر عجیب بات ہے کہ میں تمھیں دیکھوں تو بے حیائی ہے اور تم مجھے نہ دیکھو تو ادائے شرم ہے۔

پاک خور امروز زنہار از پئے فردا منہ   در شریعت بادۂ امروز آبِ فردا آتش ست

شریعت بتاتی ہے کہ آج جو چیز شراب ہے کل وہی دوزخ کی آگ ہو جائے گی، اس لئے مناسب یہی ہے کہ اسے آج ہی ... یہاں ختم کر دی جائے تاکہ وہ آگ نہ بن سکے۔

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ ما را   مومن نبود غالبؔ و کافر نتواں گفت

در قالب مُلّا اثر شب پردہ کشا شد   خاکے کہ قضا در تن گوسالہ فرو ریخت

یعنی مُلّا کا حال بالکل گوسالۂ سامری کا سا ہے کہ اس میں خاک پائے جبرئیل ڈال دی گئی تھی اور وہ بولنے لگا تھا۔ مدعا یہ کہ مُلّا خو... اپنی عقل کچھ نہیں رکھتا۔

نیکی زتست از تو نخواہیم مزد کار   ور خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست

خدا پر طعن ہے کہ جب نیکی بھی تیری ہی طرف سے ہے اور ہم اس کا انعام طلب نہیں تو پھر بدی کا انتقام کیسا جبکہ وہ بھی تیری ... طرف سے ہے۔

رضواں چو شہد و شیر بغالبؔ حوالہ کرد   بیچارہ باز داد و مئے مشکبو گرفت

یہ طنز ہے فردوس کے لذائذ پر کہ وہاں کے شہد و شیر سے شراب بدرجہا بہتر ہے۔

شباب و زہد! چہ ناقدر دانی ہستی ست   بلا بجان جوانان پارسا ریزد

یعنی عالم شباب کی پارسائی زندگی کی توہین ہے۔

مے بزاہد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب   پیش ایں قوم بہ شوربائے زمزم نرسد

خواجہ فردوس بہ میراث تمنا دارد   وائے گر در روش نسل بہ آدم نرسد

زاہد فردوس کا مدعی ہے اس بنا پر کہ وہ اولاد آدم میں سے ہے، بڑا مزہ ہو اگر اس کا شجرۂ نسب آدم تک نہ پہونچے۔

زاہد نہ ہر آئینہ بہ پرہیز گفتہ اند   آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

زاہد از حور بہشتی بجز ایں نشناسد   کہ شود دست زد شوق و بکارت نہ رود

زانچہ دل زہم پاشد دل چہ طرف بربندد   یا محال گفتن وہ یا نگفتہ باور کن

ایسی چیز جو دل کے ٹکڑے اڑائے دیتی ہے۔ بھلا دل اس کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ بہتر یا تو آپ اس کے کہنے کی مجھے اجاز... ورنہ بغیر کہے یقین کیجئے۔

بخون من اگر ننگست دست و خنجر آلودن   نوید وعدہ کز انتظارم میتواں کشتن

گر میرے خون میں دست و خنجر کو آلودہ کرنا باعث ننگ ہے تو اس سے زیادہ آسان ترکیب یہ ہے کہ وعدہ کر لیجئے انتظار
ے آپ مر جاؤں گا۔

طاق شد طاقت ز شفقت بر گراں خواہم شدن   مہرباں شو ورنہ بر خود مہرباں خواہم شدن

ہ میں اب آپ کے ناز اٹھانے کی تاب و طاقت نہیں ہے، اس لئے یا تو مجھ پر آپ مہربان ہو جائیے۔ ورنہ خود اپنے اوپر
ہو جاؤں گا اور آپ سے کنارہ کشی اختیار کروں گا۔

جاں داد بہ غم غالب خوشنودی روحش را   در بزم عزا مے کش در نوحہ غزلخواں شو

ب کا انتقال ہو گیا۔ اب ان کی روح پر فتوح کو یوں ثواب پہونچایئے کہ مجلس عزا میں بیٹھ کر شراب پیجئے اور نوحہ میں غزل خوانی کیجئے

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بہ غارت بر   بر خرمن ما برقے بر مزرعہ باراں شو

ر لوٹنے کا ارادہ ہے تو پہلے سرمایہ عنایت فرمائیے۔ خرمن پر آپ برق بنے ہیں تو کھیت پر باران رحمت بنئے۔

ناز مومن و کافر برچہ دستگاہ آخر   سبحہ و مسواکے قشقہ و زنارے

ماتے ہیں کہ یہ مومن اور کافر آخر کس چیز پر اتراتے اور اینڈتے پھرتے ہیں ان کے پاس رکھا کیا ہے۔ مومن کے پاس صرف
سواک ہے اور کافر کے پاس فقط قشقہ و زنار۔

بسکہ دیوار و در از دود دلم گشت سیاہ   کلبۂ من بہ سیہ خانۂ لیلے ماند

پنے گھر کو بھی کہتے ہیں کہ میرے دود آہ سے سیاہ ہو کر خیمہ لیلےٰ بن گیا ہے۔

فارغ از ہنگامہ سرتا سر بیکاری گزشت   رشتۂ عمر خضر از حساب جنبش نیست

تے ہیں کہ خضر کا رشتۂ عمر بے حساب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہنگامے سے علیحدہ مزے سے بیکاری کی زندگی گزار رہے ہیں۔

موئے کہ بروں نامدہ باشد چہ نماید   بیہودہ در اندام تو جستیم میاں را

شوق کی کمر کو ایک ایسا بال بتایا ہے جو ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔

رنگہا چوں شد فراہم مصرفے دیگر نداشت   خلد را نقش و نگار طاق نسیاں کردہ ایم

ت کو کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بہت سے رنگ فراہم ہو گئے تھے اور مصرف کوئی تھا نہیں اس لئے
ں کو اپنے طاق نسیاں کی زیب و زینت بنا دیا ہے۔

ظ سفید پوش کی ایک تشبیہ ملاحظہ فرمائیے جو سنگ رخام کی لوح مزار سے دی گئی ہے فرماتے ہیں۔

گر واعظ دل مردہ سفید است ردائش   خود لوح مزارے است کہ از سنگ رخام است

کا منظر دکھاتے ہوئے بتاتے ہیں کہ آج زاہد بھی حجرے سے نکل آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جانور پنجرے سے باہر آ گیا ہے۔

زاہد بہ نشاطے زدہ از حجرہ بدر گام   کز کنج قفس مرغ گرفتار بر آمد

و غیرہ جو اعداد رقم پر کھینچ دی جاتی ہے اور کوئی معنی نہیں رکھتی۔

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم بڑی مصیبت میں ہیں ہماری تمنا اور خواہش بہشت سے آگے بڑھ گئی ہے یعنی جنت ہماری نگا
میں کچھ بھی نہیں ہے اور ادھر حالت یہ ہے کہ جنت سے بڑھ کر کوئی جگہ پیدا نہیں ہوتی

تمنائے من از خلد بریں بگزشتہ   یا خود امید گہے در خور آں میبایست

ایک جگہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش آسمان پھٹ پڑے خواہ وہ ہمارا ہی سر کیوں نہ ہو۔

خوشا کہ گنبد چرخ کہن فرو ریزد   اگرچہ خود ہمہ بر فرق من فرو ریزد

ایک جگہ کہتے ہیں کہ سیکڑوں باتیں ایسی ہیں جو میں اس سے کہنا چاہتا ہوں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ نازک مزاج
کاہے کو سنے گا کوئی ایسی ترکیب ہونا چاہئے کہ سب تمنائیں کسی ایک تمنا میں تبدیل ہو جائیں اور اس کی ترکیب یہ ہے
اس کے لب پر لب رکھ کر مر جانا چاہئے۔

لب بر لب دلبر نہم و جاں بسپارم   ترکیب بیکے کردن صد ملتمس است ایں

غالب میدان قیامت میں ہیں، اور تمام عمر کے گناہ معاف کر دئے گئے ہیں۔ آپ گناہ بخشنے والے سے کہتے ہیں کہ خدا می
بے مائگی پر رحم فرمائیے کہ آپ کے دست کرم نے عمر بھر کے گناہوں کو ایک اشارہ میں برباد کر دیا۔ میں بھی کس قدر تنگ مای
کم حیثیت آدمی نکلا:۔

بر تنگ مائیم رحم کہ یک عمر گناہ   ہم بتاراج یک دستی بخشودن رفت

کسی شاعر سے کہتے ہیں کہ اگر آپ کی غزل میری غزل سے زیادہ سرسبز ہوتی ہے اور اس پر چیخ پکار زیادہ ہوتی ہے تو
کیا ہے۔ چنگ سے ہمیشہ ڈھول کی آواز زیادہ ہوتی ہے۔ حالانکہ چنگ چنگ ہے اور ڈھول ڈھول :۔

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتہ   کے بہ پچہ گوئی فلاں در شعر ہم سنگ من است
راست گفتی لیک میدانی کہ نبود جائے طعن   کمتر از بانگ دہل گر نغمۂ چنگ من است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ بڑے بیوقوف ہیں وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں حسینوں میں وفا نہیں ہوتی۔ بھلا تجربہ کر ہمارے معشوق
جب سے جفا کرنا شروع کی ہے آج تک برابر جفا کرتا چلا جاتا ہے۔ عمر گزر گئی اور اس نے اپنی وضع کو نہیں چھوڑا۔

عمرے سپری گشت و ہماں بر سر جور است   گویند بتاں را کہ وفا نیست چرا نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اچھا صاحب اگر میں التفات کے قابل نہیں ہوں تو نہ سہی۔ آرزو اور تمنا تو کرنے دیجئے، ایک مفل
آدمی کی خوشی کیمیا سازی پر مبنی ہوتی ہے ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ سونا بنائیں۔ مگر عمر بھر میں ایک دفعہ بھی نہیں بنا
ایسے ہی میری آرزوئیں ہیں:۔

بہ التفات نیرزم در آرزو چہ نزاع   نشاط خاطر مفلس ز کیمیا طلبی است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ چاہتا تو میرا محبوب بھی یہی ہے کہ میں مر جاؤں۔ مگر وہ اپنی زبان سے نہیں کہتا کہ ایسا نہ ہو کہ
میں خوشی سے جان دیدوں۔ کیونکہ اس کو میرا مرنا گوارا ہے مگر خوشی سے مرنا گوارا نہیں۔

زیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی   نگوید ار چہ بمرگ من آرزو مند است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس بات کا بالکل اطمینان ہے کہ جہنم کو ہمارے جلانے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ غم ہم کو روز گھلا

ایک جگہ معشوق کو بلانے کی یہ ترکیب نکالی ہے۔ کہتے ہیں ہاں صاحب ٹھیک ہے، میں کہتا ہوں کہ پھول گلشن میں بڑا اچھا معلوم
ہوتا ہے، لیکن آپ اس کو غلط سمجھتے ہیں تو غصہ میں باہر چلے آئیے اور میری غلطی ثابت کر دیجئے:۔

بے پردہ شو ز غصہ و الزام دہ مرا   گفتم کہ گل خوش است بگلشن دریں چہ بحث

مرزا کی سوگوارانہ زندگی پر نظر دوڑانے والے پہلی ہی نظر میں اُن کی بدبختی کا اندازہ کر لیتے ہیں اور ان کے مصائب حیات کا نقشہ
نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مگر مرزا جہاں کوئی اس قسم کا واقعہ بیان کرتے ہیں اس کو اس طرح رنگ دیتے ہیں کہ حزن و ملال
پہلو بھی ایک نشاط آمیز تصور ہو جاتا ہے۔

ایک قطعہ میں اپنی بدنصیبی کا بیان کرتے کرتے کہتے ہیں کہ میاں غالب آخر یہ بات کیا ہے کہ تم آج کل اس قدر مفلوک الحال
ہو رہے ہو۔ نہ کھانے کا سامان ہے نہ پینے کا۔ نہ کہیں سے پیسہ ملتا ہے نہ ٹکا ——— نہ اپنوں سے نفع پہونچتا ہے نہ بیگانوں سے۔ جب
یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خدا رزاق ہے اور بندوں کے رزق کا کفیل ہے پھر آخر تمھیں کیوں نظر انداز کر دیا ہے؟ یہ بھی معلوم ہے کہ
خدا بخیل ہے۔ اور نہ آپ ابھی مر ہی گئے ہیں۔ تو یہ کیا قصہ ہے کہ تم قوت لایموت کے لئے بھی محتاج ہو ——— معلوم یہ ہوتا
کہ عرصہ سے تمھارا آب و دانہ اُٹھ گیا ہے، اور تمھارے مار ڈالنے کا حکم خدا کی طرف سے جاری ہو چکا ہے۔ فرشتۂ
رزق بالکل بے خطا ہے اگر تمھارا رزق ہوتا تو ضرور تم کو پہونچتا۔ مگر فرشتۂ موت حضرت عزرائیل، خدا انھیں زندہ رکھے کچھ ڈھیل
ڈال رہے ہیں اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے ہیں:۔

الا زیاں زدہ غالب کہ از صدقۂ بخت   نمی رسد بجو خار و خسے ز ہیچ سبیل
چو لازم است کہ پروردگار تا دم مرگ   بود برزق ضروریۂ عباد کفیل
چراست اینکہ نداری ز ناز سیاہ و سپید   چراست اینکہ نیابی براز کثیر و قلیل
نیادہ در سر ایں رشتہ عقدۂ ورنہ   نمردۂ تو و نے رازق العباد بخیل
ز چند سال بہ برگ تو ؤ تباہی رزق   شداست حکم تو از پیشگاہ رب جلیل
فرشتۂ کہ وکیل است بر خزائن رزق   نکرد ہیچ توقف برزق در تعطیل
دوم فرشتہ کہ یادش بخیر مقروں باد   روا نداشت در اہلاک شیوۂ تعجیل
لطیفۂ کنم از قول شاعرے تضمین   کہ در لطیفہ مرا دو رالے بود وسیل
اگر خدائے جہاں کہ زندۂ تو ہنوز   ہزار مشت زند بردہان عزرائیل

ایک جگہ اپنی بیکسی اور تنہائی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں ایسا معلوم ہوتا ہوں، جیسے خو
دربان ہوں:۔

ماندہ ام تنہا بکنج از دور باش پاس وضع   خانۂ دارم کہ پندارند دربانش منم

ایک جگہ اپنی بہشت کا حال بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارے بہشت میں اگر کوئی پھلنے پھولنے اور بڑھنے والا
ہے تو دوزخ کا زقوم ہے:۔

نور خرد در آگہی خواہش تن پدید کرد   صرف زقوم دوزخ ست تاک بہشت ما

گئے تم ختم ہو جائیں گے اور جہنم تک جانے کا قصہ ہی نہ رہے گا:۔

نیست ذوقی کہ با کاہشے از غم نہ رسد   نوبت سوختنم با جہنم نہ رسد

ایک جگہ معشوق سے کہتے ہیں کہ کیا تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ میں حشر کے دن داور حشر کے سامنے شکایت کرنے بیٹھوں گا۔ تمھارا
غلط ہے کیونکہ ہجوم نالہ کی وجہ سے ایک نالہ بھی میرے لب سے نہ نکل سکے گا:۔

زمن مترس کہ نالہ بہ پیش داور حشر   ہجوم نالہ نیم راز نالہ وا دارد

ایک جگہ زاہد اپنے کسی دوسرے ہمنشین سے کہتے ہیں کہ بھائی صاحب شیطان سے آپ ڈرتے۔ آپ کے پاس دین و ایمان ہے
پاس نہ دین ہے نہ ایمان، ہمیں خوف و فکر کی کیا ضرورت:۔

تو داری دین و ایمانے بترس از دیو و نیرنگش   چو نبود توشۂ راہے چہ باک از رہزنم باشد

ایک جگہ ناصح سے کہتے ہیں کہ بابا میں تو میرے سر ہو گیا ہے۔ میں کافر ہوں تو کیوں بُرا سمجھتا ہے۔ ذرا ابراہیم کو دیکھ انھوں نے
آذری کو ٹھکرا کر ملت ابراہیمی جاری کر دی تھی۔ بات یہ ہے کہ جو اہل نظر ہیں وہ پُرانی لکیر کے فقیر نہیں رہتے ہیں:۔

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر   ہرکس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

آپ کے ایک دوست مرزا الف بیگ کی پیرانہ سالی میں لڑکا پیدا ہوا۔ انھوں نے ہمزہ بیگ اُس کا نام رکھا۔ مرزا نے مُبارکباد
لکھ کر بھیجا۔ جس میں بڑی ظرافت سے کام لیا ہے۔ عربی میں الف کو بھی ہمزہ ہی کہتے ہیں۔ اسی کو مدنظر رکھ کر مرزا کہتے ہیں کہ
کے لڑکے کا نام ہمزہ بیگ کیوں نہ ہوتا۔ الف جب منحنی ہوتا ہے تو ہمزہ کہلاتا ہے۔ الف کا منحنی ہونا الف بیگ کے بڑھاپے
پر بہترین روشنی ڈال رہا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ ظاہر کرتا ہے کہ باپ کے خصوصیات بچے میں تبدیل ہو جاتے ہیں:۔

چوں الف بیگ در کہن سالے   پسرے یافت سربسر غمزہ
نام او ہمزہ بیگ کرد بلے   الف منحنی بود ہمزہ

سی سے کوئی سوال کرنا، کچھ مانگنا، اپنی حاجت کا اظہار کرنا عیب ہے۔ مگر یہ اس طرح جیسے کہ مرزا کوئی سوال کرتے ہیں۔
یوں سوال کر رہے ہیں کہ ساقی تجھے معلوم ہے میں پشنگ اور افراسیاب کی اولاد سے ہوں اور اس طریقہ سے تو نے سمجھ ہی لیا
جمشید کی اولاد میں ہوں۔ لہٰذا مجھے میراث جمشید ملنا چاہئے۔ شراب جو جم کی طرف سے وراثتاً مجھ کو پہونچتی ہے وہ اب دیجئے
بعد بہشت تو مل ہی جائے گی، کیونکہ میں آدم کی اولاد ہوں اور بہشت آدم کی میراث ہے:۔

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم   دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار   زاں پس کہ رسد بہشت کہ میراث آدم است

نواب یوسف علی خاں مرحوم سابق والی رام پور کو جب گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ریاست عطا ہوئی تو مرزا نے مبارکباد کے قطعہ
میں لکھا کہ کچھ دے ڈالئے، میرا مطلب خلعت ریشمی نہیں، حریر نہیں ایک کمبل ہی سہی:۔

مقصود ز لباس بجاں پوشش تن است   پوشش گر از حریر نباشد گلیم باد

شوق سے آنے کی التجا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا اگر تو میرے انتظار کا یقین نہیں کرتا تو لڑنے کے لئے چلا آ۔ مگر آ۔

زمن گرت نبود باور انتظار بیا   بہانہ جوئے مباش و ستیزہ کار بیا

غالب بسخن گرچہ کسے ہمسر نیست　　از نشّۂ ہوش ہیچ اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز و دانگ شبا کہ　　ایں بادہ فروش ساقیِ کوثر نیست

ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است　　بر خاکِ رہِ عجز سرے داشتہ است
زاہد ز خدا ارم بہ دعویٰ طلبد　　شدّاد ہمانا پسرے داشتہ است

یعنی ہر وہ شخص جو اپنی فانی حقیقت سے آگاہ ہے وہ ہمیشہ عجز و فروتنی سے کام لیتا ہے، لیکن زاہد کی انانیت دیکھئے کہ وہ خ
سے بہشت طلب کرتا ہے اور دعوے کے ساتھ، اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ شدّاد کی نسل سے ہے اور وراثتاً بہشت شدّاد کا طلبگار ہے

گرویدنِ زاہداں بہ جنت گستاخ　　دیں دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ　　ماند بہ بہائم و علف زارِ فراخ

جنت کا تصور زاہدوں نے یہ پیش کیا ہے کہ وہ ایک باغ ہے پھل والے درختوں کا جس کے پھل اہلِ بہشت آزادی سے توڑ توڑ کر
کھاتے پھریں گے۔ اس پر غالب طنز کرتا ہے کہ اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جنت ایک وسیع چراگاہ ہے جس میں زاہد جانوروں
کی طرح آزاد چھوڑ دئے جائیں گے اور ہر جگہ چرتے پھریں گے۔

در عالمِ بے زری کہ تلخ است حیات　　طاعت نتواں کرد بہ امیدِ نجات
اے کاش ز حق اشارتِ صوم و صلوٰۃ　　بودے بہ وجودِ مال چوں حج و زکوٰۃ

غربت و افلاس کے عالم میں بہ امیدِ نجات طاعت و عبادت کا سوال نہایت عجیب و غریب ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ جس طرح حج و
زکوٰۃ کے لئے مقررہ مال کا پایا جانا ضروری ہے، اسی طرح روزہ نماز کے لئے بھی کوئی شرط ہونا چاہئے تھی یہ کیا کہ کھانے کو پاس نہیں لیکن نماز
ضرور پڑھو اور روزہ ضرور رکھو۔

اید کہ دلت ز غصہ برہم نشود　　از رفتنِ زر ز دست خوش غم نشود
ایں سیم و زر است خواجہ ایں سیم و زر است　　غم نیست کہ ہر چند خوری کم نشود

یعنی لوگوں کا یہ کہنا کہ دولت ہاتھ سے نکل جائے تو غم نہ کرو، سمجھ میں نہیں آتا۔ لوگ دولت اور غم کے فرق کو جانتے ہی نہیں، دولت
تو خرچ کرنے سے ختم ہو جاتی ہے لیکن غم کا یہ حال ہے کہ جتنا کھاؤ وہ کم ہونے میں نہیں آتا۔

یا رب بہ جہانیاں دلِ خرم دہ　　در دعویِ جنت آشتی باہم دہ
شدّاد پسر نداشت باغش از تست　　آں مسکنِ آدم بہ بنی آدم دہ

اللہ تعالیٰ سے استدعا کرتے ہیں کہ اے خدا یہ دنیا والے جو جنت کے دعویدار ہیں۔ ان کو صلح کرنے کی توفیق عنایت فرما۔ اس کی وجہ یہ ہے
کہ شدّاد کا کوئی وارث نہیں تھا۔ کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے اس کا باغ ضبط کر لیا گیا مگر جنت کا باغ ہمارے دادا آدم کا تھا۔ آدم کا
مسکن بنی آدم کو مل جانا چاہئے۔ اُن کی اولاد موجود ہے۔ شدّاد کی طرح وہ لاولد تھے۔

اسی طرح کی ایک رباعی ہے کہتے ہیں کہ ساقی روزِ ازل نے میری قسمت کے پیالہ میں زہر ہی زہر بھرا ہے کسی طرح چین نہیں ہے تو
سعادت و نحوست کو لے پھرا ہے۔ یہ سب فضول ہے، مجھے سعادت نے بھی مارا اور نحوست نے بھی۔

آنم کہ بہ پیالۂ من ساقیِ دہر　　ریزد ہمہ دُرد و دَرد و تنہا زہر
بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا　　ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر

ایک جگہ کہتے ہیں کہ زمانہ کے رنج و غم نے ہمیں ہر طرح سے تباہ کیا۔ ایک طرف تو خاص لوگوں کے عیش و عشرت نے تباہ کیا،
دوسری طرف عوام کی آزادی اور فارغ البالی نے

غالب غمِ روزگار ناکام کشت　　از تنگیِ دل بحلقۂ دامم کشت
ہم غیرتِ سرسبزیِ خاصم سوخت　　ہم رشکِ نشاط مندیِ عامم کشت

ایک جگہ معشوق سے کہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں آنا چاہئے۔ غیر کے گھر کی طرف سے نہ آؤ تو دوسرے رستہ سے آؤ، مگر آؤ
تم نے کہا تھا کہ مجھے بلانا نہیں۔ میں تمہاری موت ہوں۔ اچھا اب اپنے قول پر قائم رہو۔ میں تمہیں بلاتا ہوں۔ موت
بے بلائے چلے آؤ۔

اے دوست بسوئے ایں فرو ماندہ بیا　　از کوچۂ غیر راہ گرداندہ بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگِ توام　　برگفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

ایک جگہ منصور کے دار پر چڑھنے کے واقعہ کو اس شوخی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ جو واحد کو واحد ہی کہے اس کا انجام وہی
ہو جو منصور کا ہوا۔ اور جو دو کہتے ہیں ان کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

منصور غرش ز نکتہ چیناں چہ بود　　در راست خطر ز خشیناں چہ بود
چوں عاقبتِ یگانہ بیناں دار است　　دریاب کہ انجامِ دو بیناں چہ بود

دنیا میں جس کو دیکھئے حسبِ حال نظر آتا ہے اگر کچھ فرق ہے بھی تو صرف ایسا جیسے خرِ عیسیٰ اور خرِ دجال میں۔

ہر چند زمانہ مجمعِ جہال است　　وز جہل بہ حال شاں بیک منوال است
کودن ہمہ یک از یکے تا دگرے　　فرقِ خرِ عیسیٰ و خرِ دجال است

ایک جگہ کہتے ہیں۔ میاں غالب ہم نے یہ مانا کہ آپ بڑے سخن گو ہیں اور اس وقت کوئی آپ کا مد مقابل نہیں ہے، مگر جناب کے
ذوقِ لطیف کی بہت کمی ہے۔ آپ کی خواہش یہ ہے کہ شراب مفت بھی ملے، نادر و نایاب بھی ہو، اور بہت ہو، سو حضرت
ممکن نہیں ہے، بادہ فروش کوئی ساقیِ کوثر تو ہے نہیں کہ یہ سب باتیں آسانی سے آپ کو میسر ہو سکیں۔

کا طنز و مزاح فارسی نثر میں

مرزا اڑتیس اُنتالیس برس کی عمر میں کلکتہ گئے۔ اُن کے بعض دوست پہلے ہی سے وہاں موجود تھے، مگر ان سے ملنے پر اور بھی نئے دوست پیدا ہو گئے، اور جس وقت دلی ئے تو ایک اچھی خاصی تعداد اُن کے احباب کی کلکتہ میں موجود تھی۔ اُنھیں میں سید علی اکبر خاں تھے جو ہگلی بندر کے امام باڑے کے ے۔ مرزا سے ان سے نہایت بے تکلفانہ دوستی ہو گئی تھی۔ انھیں کے نام ایک خط میں آموں کی فرمائش کرتے ہیں۔ انداز ظرافت آمیز ندرت دیکھئے:-

"قبلۂ خدا پرستاں سلامت!

ممدوح از ستایش مستغنی۔ و مادح در بیان نارسا۔ چہ گویم تا آبروے خوشی مزید و چہ گویم تا داغ کوتہ قلمی برخیزد۔ ایں عبودیت نامہ را قماش سلام روستائی است۔ و دائرہ ہر حرفش را پرکار کاسۂ گدائی۔ شکم بندہ ام۔ و قدرے ناتواں۔ ہم آرایش خوان جویم۔ و ہم آسایش جان۔ خرد و دل دانند کہ ایں ہر دو صفت بانبہ اندر است۔ و اہل کلکتہ بمانند کہ ظرف ہگلی بندر است۔ آرے انبہ از ہگلی۔ و گل از گلشن۔ ایثار از جناب۔ و سپاس از من۔ شوق می سگالد کہ ہر آئینہ تا پایان فصل دو سہ بار بخاطر ولی نعمت خواہم گزشت و آرزو می نالد۔ کہ حاشا بریں مایہ برخوردار نخواہم گشت۔"

پہلے تو وہ اپنی شوخی القاب سے ظاہر کرتے ہیں۔ آگے بڑھتے ہیں تو ان القاب آداب و مزاج پرسی و ظاہری تعریف سے قطع نظر ہیں۔ کہ مجھی نہ تمھیں تعریف سننے کا شوق۔ نہ مجھ میں تعریف کرنے کا دم۔ خط کو خط نہیں بتاتے بلکہ سلام روستائی کرتے ہیں یا ئی بہر حسن طلب ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں۔ کچھ تو میں پیٹ کا بندہ ہوں اور کچھ ناتواں۔ لہٰذا اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت یش خوان۔ و آسایش جاں۔ اب ایسی چیز کہاں ہے جس میں یہ دونوں صفات موجود ہوں۔ مگر لوگوں کی رائے میں یہ دونوں آم میں ہیں اور کلکتہ والوں کا خیال ہے کہ آم ہگلی بندر میں ہوتا ہے۔ سچ ہے جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ چار چیزیں ہیں۔ آم ہگلی میں۔ پھول باغ میں۔ ایثار جناب میں اور شکر خاکسار میں مگر ایک عجیب بات سنئے مجھ میں دو چیزیں ہیں شوق ۔ دونوں مختلف ـــــ شوق تو کہہ رہا ہے کہ فصل بھر میں کم از کم میرے آقا نے نعمت دو تین بار مجھے یاد کریں گے۔ اور حرص کہ واہ۔ دو تین بار میں میرا کیا بھلا ہوگا۔

شی محمد حسن مرزا کے کوئی خاص دوست تھے۔ اُن کے صاحبزادہ احمد حسن کی شادی ہوئی۔ مرزا کو قصیدہ نہیں تو کم از کم کوئی ر لکھنا چاہئے تھا۔ مگر خدا جانے عدیم الفرصت تھے، فکر مند تھے یا اور کوئی بات تھی، کچھ بھی نہ کر سکے۔ آخر کار عذر میں ایک جس میں وہ سب کچھ لکھ گئے جو ایسے مواقع پر بہ سلسلۂ تہنیت لکھا جا سکتا ہے۔

"ہم در و دیوار را بہ جوش بہار اندودے۔ و ہم گوشہ و کنار گیتی را بفروغ نیرنگ چراغاں نمودے۔ تا نظارہ را دیدہ را نیاں پری آوردے۔ و دو آئین بستے و ہم بافتہ ہاں ہمایوں انجمن گستردے۔ بہ پیمانہ محفل میوہ و گل از طوبے فشاندے۔ و زہرہ را بر امشگری و رضواں را بہ جہانی خواندے۔"

جی مجھے توفیق ہوتی تو در و دیوار سجاتا۔ چراغاں کرتا۔ طرۂ حور و بال پری سے فرش طیار کر کے اسے محفل میں بچھاتا۔ شجر طوبیٰ کے میوے ـــــ اور پھول لٹاتا۔ زہرۂ فلک کو رقص دعوت دیتا اور رضوان کو بھی اس بزم میں شریک کرتا۔

مرزا کو اپنی جاگیر کے معاملہ اور مقررہ رقم کے لئے فیروز پور جانا پڑا۔ وہاں نواب نے کچھ امیدیں دلائیں، معاملہ کے انفصال کا اطمینان دلایا اور مرزا صرف اس وعدہ پر مطمئن ہو کر دہلی چلے آئے۔ مدتیں ہو گئیں مگر کچھ انفصال معاملہ نہ ہو سکا۔ ناچار ہو کر مرزا علی بخش خاں کو جنھیں مرزا بھائی کہتے تھے اور اپنا معین و مددگار سمجھتے تھے۔ ایک خط لکھا جس کا ہر فقرہ اُن کی دل برشتگی اور انتظار کا پتہ دیتا ہے، دو تین فقرے غصہ اور انتظار کی انتہا کو ظاہر کرتے ہیں، اپنے خاص رنگ میں فرماتے ہیں:-

"کیچند با امید نواب صاحب ساختم، و از تاب آتش انتظار گداختم، نشستہ ام بہ عذابے کہ مجرم بہ زنداں نشیند۔
و می بینم آنچہ کافر بہ جہنم بیند۔"

ایک مرتبہ دوپہر کو ظہر کے وقت مرزا، مفتی صدر الدین آزردہ کے یہاں پہونچے، کنڈی ہلائی۔ اندر سے نوکر نکلا، جواب دے گیا کہ مفتی صاحب موجود نہیں ہیں۔ مرزا واپس آئے اور آکر اسی روز مفتی صاحب کو ایک خط لکھا۔ جس میں نوکر کے باہر نکلنے اور اپنے پلٹنے کو عجب دلکش انداز سے تشبیہ دے کر فرماتے ہیں:-

"ہمانا آں پرستارہ واں برآمدن کام دل دشمن بود۔ و من دریں برگشتن بخت خویشتن۔"

شیخ امام بخش ناسخ کا دیوان طبع ہوا تو انھوں نے ایک جلد موسیٰ جان کی معرفت مرزا کے پاس بھی روانہ کی۔ مرزا نے جواب میں شکریہ لکھا اور ایک بڑا چبھتا ہوا فقرہ بھی تحریر فرما دیا:-

"بخت خود را برسائی ستایم۔ و بجا دارم۔ کہ بطور معنی رسیدہ ام۔ خود را بہ دانائی آفریں گویم و انتقام کہ موسیٰ را
بامید بیضا دیدہ ام۔"

مرزا کے ایک دوست لالہ ہیرالال ایک مرتبہ مولوی فضل حق خیرآبادی سے ملنے گئے۔ وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ مولانا کے مکان کے قریب آگ لگ گئی تھی۔ مگر اتفاق ہے مولانا کا نقصان بالکل نہ ہوا۔ یا ہوا تو اتنا کہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ جب واپس آئے اور مرزا سے ملاقات ہوئی تو اس حادثہ کی بھی خبر دی۔ مرزا نے فوراً مولانا کو ایک شکایتی خط لکھا۔ اور اس بات پر افسوس کیا کہ آپ نے اتنے بڑے جانکاہ حادثہ کی مجھے اطلاع بھی نہ دی۔

"ہائے اے وفا دشمن۔ بیگانگاں کامیاب پیام و نامہ۔ و آشنایاں جگر تشنۂ رشحۂ خامہ۔

وائے بریں کہ رقیب از تو مراد یابد
نامۂ واشدہ مہر بہ عنواں زدہ"

ایک مرتبہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا خط آیا۔ خط میں شعر و شاعری کا کوئی ذکر نہ تھا۔ مرزا نے پڑھ کر جواب دیا اور جواب میں دو ظرافت آمیز تشبیہیں بھی استعمال کر گئے، اس زمانہ میں شانہ میں درد تھا فرماتے ہیں:-

"سو گواہ ہے کہ ... دلم از درد شانہ، چنانکہ مومن بہ ہر پیشہ از رنج بہ جسماو در آزار باشد، بیچارہ بود۔ سروشے از در در آمد
و بہ سپردن بہار سامان نامہ رنگ بجیب تمنا ریخت۔"

قدسی مفاد ضد از شعر و غزل چوں نامۂ اعمال زاہد از ذکرے و شاہد سادہ بود۔"

دونوں جگہ تشبیہیں بڑی نادر استعمال کی ہیں ـــــــــ دل کو مومن عبرتیہ اور
...تانہ کو رنج ہمسایہ کہنا تو لطیف تھا ہی، خط میں جو شعر و شاعری کا ذکر نہ تھا تو اُس کو نامۂ اعمال زاہد کی طرح سادہ
...لطیف تربات تھی۔

ایک مرتبہ شیفتہ مرحوم کا عرصہ تک خط نہ آیا۔ مرزا نے اپنے رنگ میں یہ شکوہ کیا:

ے رنجد از تحمل ما بر جفائے خویش   ہاں شکوہ کہ خاطر دلدار نازک است

"اگر بے پروائیست چنیں نمی بایست، ور شکیب آزمائی است۔ نہ بدیں اندازہ رہا بود۔ اگر از ناکسی با لتفات نیرزم۔
ناکساں را بہ سخن دیر کردن و ننگ شکوہ بے شکوہاں بجز پذیرفتن از چیست۔ و اگر ہمی تقاضا ہائے بے محابا و فراموشی
ہائے جانگزا از عالم مکافات بہ مثل است مرا کہ بزہ مندم۔ گو نہ تو اختی و ساز پورش مرا بہ تو اور دن گناہ چیست"

الفاظ ایسے نہ سہی کہ ان سے خندہ یا ضحک پیدا ہو۔ مگر پھر بھی یہ منطقی استدلال کس قدر لطیف ہے کہ اگر بے پروائی ہے تو
...چاہئے تھی۔ اور اگر صبر آزمائی ہے تو اتنی صبر آزمائی کی ضرورت نہ تھی۔ اور اگر نالایقی کی وجہ سے میں التفات کے قابل نہیں
...مجھ سے نامہ و پیام کیوں کیا۔ اور اگر بدلہ لیا گیا ہے اور میری غفلت کا جواب دیا ہے تو پھر مجھے شکوہ سے کیوں محروم کیا
...میں گناہگار تھا تو مجھے متنبہ کیا جاتا۔

مفتی صدر الدین آزردہ سے سفارش چاہتے ہیں اور عجیب طرح سے اپنا حق ثابت کرتے ہیں:

"قبلۂ حاجات۔ اگر ایں بندۂ اندک شنو بسیار گوئے۔ زود گستاخ، پریشاں را حق بندگی نیست۔ از کجا کہ ہمیں
بے بضاعتی نتواں بخشود ے

گیرم وفا نہ دارد و از ہم بہ اگر است   زیں سادگی کہ دل بہ از ہم بستہ ایم ما

سخن کوتاہ ہر گونہ عنایت کہ درباں کارسازی بکار رفتہ باقی در حق کہری مرزا افضل بیگ صرف گردد۔ اگر چہ آں صرف
از اسراف بجائے رسد کہ بہرہ از بہر من نماند۔"

کس قدر دلچسپ استدلال ہے یہ کہ اگر میرا کوئی حق نہیں ہے تو میری بے بضاعتی پر رحم کیجئے۔ اس سے پہلے جو سفارش آپ
...نے جو کچھ اس میں سے باقی بچی ہو وہ مرزا فاضل بیگ کے حق میں صرف کر دیجئے، چاہے یہ صرف اسراف کی حد میں آ کر یہاں تک
...جائے کہ میرے لئے کچھ باقی نہ رہے۔

حکیم مومن خاں ہر سال تقویم بنایا کرتے تھے اور اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ مرزا کو اگرچہ نجوم میں بہت کم دخل تھا پھر
...مرتبہ حکیم صاحب کو لکھا کہ اگر اس سال کی تقویم طیار ہو تو ذرا بھیجئے میں بھی نوروز کی کیفیت دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور
ساتھ ہی ایک مشہور و معروف لطیفہ اپنے انداز خاص میں بیان کرکے مزاحیہ رنگ پیدا کر دیا فرماتے ہیں:

"زہے ناداں ہوس پیشہ کہ من باشم۔ وہ شوید خورشید و سندہ گرم تھا کہ دل نہادن من، آثار نوروزی بچشم داشت فرخی
و فیروزی از روئے مثال بوالعجب آں کنیزکم خرد سال ماند۔ کہ چوں شب عید ششم نشان ماہ تازہ در گرفت وبرو
عید آمد و عید آمد نوائے شادی بر گرفت خاتون گفت تن زن۔ اگر عید است در رمضان تو و جان و غم سوختہ نان"

یعنی جیسا میں نوروز دیکھ کر کیا کروں گا۔ میری بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے کسی لونڈی نے عید کا چاند دیکھ کر خوشی کے جوش میں
کہا کہ بیوی، بیوی کل عید ہے۔ بیوی نے جھڑک کے کہا بیٹھ مردار عید ہو یا رمضان تیری قسمت میں تو وہی جلی روٹی لکھی ہے۔

مسٹر اسٹرلنگ نے مرزا کی کاربرآری کا وعدہ کر لیا تھا اور حتی الوسع وہ ان کے معاملہ میں کوشاں تھے اتفاقاً جوان مر گئے جس کا
مرزا کو بیحد صدمہ ہوا۔ اسی زمانہ میں مولوی سراج الدین احمد کو جو غالباً لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور کلکتہ میں ملازم تھے ایک خط لکھا
جس میں اس جواں مرگ کی موت پر افسوس بھی ہے۔ اپنی بد قسمتی کا رونا بھی ہے۔ مگر با اینہمہ جس رنگ سے اس کا اظہار کیا ہے
اس میں اپنا خاص رنگ نہیں چھوڑا۔ فرماتے ہیں:

"حیرتے داشتم کہ بمرگ ناگاہ در گزشتن امیر چوں دولت جواں سال یعنی مسٹر اندرو اسٹرلنگ ستودہ خصال برائے
چیست۔ دکار پردازان والا گہر قضا ازیں سانحۂ سترگ کدام نتیجہ منظور دارند۔ حالیا حالے سترگ کہ بسیلاب
فنا دادن بنائے امید داری غالب رمیدہ بخت میخواستند۔ و آں صورت نمی بست الا بظہور ایں طوفان
ہوش ربا"

یعنی میں سوچ رہا تھا کہ مسٹر اسٹرلنگ کیوں مرے اور اس جواں موت سے کارکنان قضا و قدر کا مطلب کیا ہے۔ اب سمجھا
آیا کہ اسٹرلنگ کے مار ڈالنے سے صرف میری امیدوں کو برباد کرنا منظور تھا۔ کیونکہ وہ امیدیں جو قائم ہو چکی تھیں اس کے بغیر فنا
ہو ہی نہ سکتی تھیں۔

مولوی سراج الدین احمد کو ایک عجیب القاب کے طریقہ پر یہ لطیف فقرے لکھتے ہیں:

"جانیکہ الطف اجزائے آں بہ تحریر رفتہ و کدورتے چوں دُرد از بادہ و خاکستر از آتش وا ماندہ است اگر بپائے دوست
افشانم ترسم کہ پائے نازنینش رنجہ گردد"

یعنی میرے پاس جان تو ہے مگر ایسی جان ہے کہ اس کے تمام لطیف اجزا تحلیل ہو چکے۔ اب جان باقی رہ گئی ہے لیکن بالکل
ایسی جیسے شراب میں دُرد۔ یا آگ میں خاکستر۔ اسے اگر آپ کے قدموں پر نثار بھی کروں تو اور یہ اندیشہ ہے کہ مبادا آپ کے
قدموں کو رنج پہونچے۔

مولوی سراج الدین احمد نے ایک مرتبہ مدت دراز کے بعد خط لکھا۔ اور خط میں یہ تحریر کیا کہ میں سمجھا تھا آپ بھول گئے ہوں گے
اور وہ جوش و خروش محبت باقی نہ رہا ہوگا۔ مرزا صاحب نے جواب میں لکھا:

"تا رسیدن نامہ ام را با افسردگی شوم حمل کردید چوں برگ من حمل نکردید با ازو داشتہ سپاسے شما محو رسند بودے۔"

"ہر قدر توانائی بیفزائے کہ اینجا مہر و وفا فراواں است۔ لاجرم جفا نیز باید کہ فراواں باشد۔ واگر خود ایں تغافل بیاد
افزاد جرمے دیگر است تحت گناہ مرا خاطر نشاں من باید کرد و آنگاہ انتقام باید کشید تا شکوہ در میاں نگنجد۔"

جب قاضی محمد صادق خاں اختر نے تذکرہ آفتاب عالم لکھا تو مولوی سراج الدین احمد کی معرفت مرزا کو بھی لکھا کہ کچھ انتخاب کرکے کلام بھیجئے۔ کچھ خاندانی حالات لکھئے۔ مرزا صاحب نے بہت سے عذر و معذرت کے بعد لکھا کہ جو کچھ برا بھلا کلام ہے وہ سب ایک دیوان میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اُس سے انتخاب فرمائیے جب آپ خود صاحب ذوق ہیں تو یہ کام آپ ہی کیجئے۔ رہا حالات لکھنا سو میرے نزدیک تو یہ کچھ دیکھئے تو مجھ پر احسان ہوگا۔

"از ناکساں روزگار۔ و بیکساں دہلی دیار مسلمان زادہ ایست کافر ماجرا۔ وگبرے است مسلماں نما۔ کہ از غلط
نمائی غالب تخلص میکند۔"

مرزا اپنی پنشن وغیرہ کے معاملہ کے لئے جب فیروز پور پہونچے تو اتفاق سے نواب احمد بخش خاں صاحب تشریف فرما تھے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مرزا انتظار میں ٹھہر گئے۔ مگر پڑے پڑے زمانہ گزر گیا نواب صاحب نہ آج تشریف لاتے ہیں نہ کل۔ عاجز آ گئے۔ رائے چھجل کھتری کو جو نواب صاحب کے معتمد خاص تھے ایک خط لکھا اور دریافت کیا کہ خدا کے لئے سچ سچ اور جلد سے جلد لکھئے کہ نواب صاحب کب تک آئیں گے۔ میں پریشان ہو گیا ہوں یہی لکھتے لکھتے چند فقرے بہت دلچسپ لکھ گئے، فرماتے ہیں:۔

"پیدا است کہ از قفس جستہ بدام افتادہ را چہ حال خواہد بود۔ و از دست نے بناخن فرو رفتہ کدام عقدہ خواہد کشود۔
جلائے وطن، و عزم سفر، و احرام غربت مصیبتے است کہ نصیب ہیچ آفریدہ مباد وائے برگنوں طالعیہا۔ و دیدہ بختیہا
کہ کہ اینجا با آرزو خواہد۔ ہر چند در وطن نیم لا اقرب نیز قیامت است۔ ہنوز با اہل کاشانہ راہ نامہ و پیام است۔
ہر چہ دیدہ می شد آشوب چشم بود۔ ہر چہ شنیدہ میشود زحمت گوش است۔ نیم جانے کہ از اں وطن بیروں آوردہ ام مگر
ودیعت خاک فیروز پور است۔ کہ مرا اینجا اقامت اضطراری افتادہ و مرگے کاوش ہزار آرزو از خدائے خواہم مگر بعدی
سرزمین موعود است۔ کہ اینقدر در رنگ افتادگیہا رو داد۔"

نواب مصطفیٰ خاں کو ایک مشاعرہ کی بابت لکھتے ہیں۔ اور اس میں اپنے مشاعرے کی شرکت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ کل جمعہ کا دن گزرنے کے بعد رات کو مشاعرہ تھا۔ چونکہ میں نے غزل وزل کچھ نہیں کہی تھی۔ اسی تہی دستی کی شرمندگی کی وجہ سے بہت حیران تھا اور مشاعرہ میں جانے کا بالکل ارادہ نہ تھا۔ نواب ضیاء الدین خاں سلمہٗ نے دو فرشتے میرے اوپر مقرر کر دئے۔ زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محو۔ یہاں تک تو سیدھی سیدھی طرح حال لکھا ہے۔ اس کے بعد اپنا وہی رنگ شروع کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"ایں ہر دو ابر دام چینہ شام گاہ بخلوت من آمدند و فیل آوردند۔ و بدانساں کہ شیر را چوں شکار کنند بر فیل بگذشتند
مرا با انجمن بردند۔"

وشمارا اہل دل و دانشور شمردے۔"

آپ نے یہ کیوں سمجھا میرا خط نہ لکھنا افسردگی شوق کی وجہ سے ہے۔ یہ کیوں نہ سمجھا کہ میں مر گیا ہوں۔ تاکہ تمہارا دوستانہ لیا جی بھی خوش ہوتا اور تمہیں اہل دل سمجھتا۔

مولوی سراج الدین احمد کے خط سے مرزا احمد کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ ابھی مرزا صاحب کلکتہ جانے کا ارادہ ہی ارادہ ھے۔ جا نہ سکے تھے۔ سخت رنج ہوا اور جواب خط میں تعزیت کے طریق پر چند دلچسپ فقرے لکھے۔ اتفاق بالائے اتفاق یہ ہوا حوم نے اور آخر ایام حیات میں دلی آنے کا ارادہ رکھتے تھے اور مرزا نے وعدہ بھی کر چکے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ اسی وعدہ ر چھوکر مرزا صاحب فرماتے ہیں:۔

"می گفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدہ فراموش بیمروت راہ گرداند۔ و تا قیامت بمنزل دیگر راند، عمر فرستم کہ خاطر
دوستاں عزیز نداشت چرا بہ حال خورد سالاں خود نپرداخت۔۔۔۔۔ ہنوز ہنگام فرود مرزا احمد نبود۔
چرا آنقدر صبر نکرد کہ بہ کلکتہ رسیدمے۔ و روئے نظارہ فروزش دگر بارہ دیدمے۔ چرا آنجا یہ در رنگ نور دیدہ
حامد علی جواں گشتے۔"

نی مرزا احمد نے اتنا بھی نہ کیا کہ میں ان سے کلکتہ آکر مل لیتا اور پھر مرتے۔

مرتبہ مولوی صاحب موصوف نے مرزا کو لکھا کہ جو کچھ اس زمانہ میں کہا ہو وہ سب خط میں لکھ کر بھیج دیجئے، مرزا صاحب میں لکھا:۔

"نفس در باد پیمائی درنگ ندارد۔ فراواں خون خوردہ جہاں جہاں پارۂ دل بدامن شمردہ می شود۔ اگر خواہم
کہ ہمہ آں را بورق اندر آرم نامہ از درازی بہ کلکتہ رسد در قم انجام گزارے نگردد۔"

اتے ہیں کہ کیا پوچھتے ہو بہت خون جگر کھایا ہے۔ بہت کچھ کہا ہے۔ اگر سب کو لکھنے کا ارادہ کروں تو کاغذ اتنا لمبا ہو جائیگا کلکتہ تک پہونچ جائے گا۔ اور پھر بھی سب نہ لکھ سکوں گا۔

جگہ مولوی سراج الدین احمد صاحب کو خط نہ بھیجنے اور پہونچانے کا شکوہ لکھتے ہیں اور یوں لکھتے ہیں کہ پڑھنے والے کی میدان حشر کا نقشہ کھنچ جاتا ہے فرماتے ہیں:۔

"زنہار صد زنہار اے مولوی سراج الدین بترس آں از خدائے جہاں آفریں۔ کہ چوں قیامت قائم گردد۔
و آفریدگار بداد بنشیند۔ من گریاں و مویہ کناں دواں ہنگامہ آیم و در تو آویزم۔ و گویم کہ ایں آنکس است کہ یک عمر
مرا بمحبت فریفت و دم برد۔ من از سادگی بروفا تکیہ کردم۔ و ایں را از دوستاں برگزیدم۔ نفس کم یافت و ویں
بے وفائی کرد۔ خدا را بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد۔ و چہ عذر پیش خواہی آورد۔ وائے بر من کہ روزگارہا
گذرد و خبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست و چہ حال دارد۔ اگر جفا پاداش وفاست۔ بسم اللہ

نواب علی بہادر مسند نشین باندہ نے جو مرزا کے نادیدہ دوست اور شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ خط میں لکھا کہ منشی نادر حسین خاں آپ کے بہت مشتاق ہیں، مرزا نے جواب میں یہ فقرہ لکھا:-

"بخدمت مشفقی شفیقی منشی نادر حسین خاں صاحب سپاس سے گزارم و سلام عرضہ۔ سلام، واقسم کہ دیدن غالب طالب اند حاشا کہ ایں داعیہ تنہا از انسو باشد۔ اگر بسیار فروتنی کنم گویم کہ شریک غالب۔"

ایک مرتبہ مولوی حبیب علی خاں کو مارچ ۱۸۶۵ء میں ایک خط لکھا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ مارچ ۱۸۶۶ء میں مولانا کا ایک خط آیا۔ انھوں نے ارقام فرمایا کہ آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ فکر ہے۔ مرزا جواب میں فرماتے ہیں:-

"یارب آں نیاز نامہ کہ در ماہ مارچ سال یک ہزار و ہشتصد و شصت و پنج عیسوی روان داشتہ ام تا مارچ سال دیگر روان۔ نہ نامہ ہرزہ عنواں۔ نہ فرستندہ کہ عبارت از مولانا محمد باقر است بیپروا، چانا آں نامہ خود از فراوانی بار مضامین شوق بر پرندگان آں مایہ گرانی کرد کہ آں سبکروی گرانجاں یعنی بریدان ڈاک انگریزی راہ بطول دو صد کروہ جز بیک سال نتوانستند برید۔"

یعنی یا اللہ جو خط مارچ ۱۸۶۵ء میں بھیجا گیا ہے۔ وہ مارچ ۱۸۶۶ء تک رواں ہے۔ یہ پتہ کیا ہے نہ خود خط بیہودہ نہ خط لکھنے والا ... معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ نامہ مضامین شوق سے وزنی ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ خط لے جانے والوں کو اتنا بوجھل معلوم ہوا کہ دو سو کوس کا راستہ ایک سال کے بغیر طے نہ ہو سکا۔

... ظرافت اُردو کلام میں

غالب کے اُردو کلام میں بھی ہم کو شوخی و ظرافت کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، لیکن بلحاظ کیفیت و کمیت فارسی سے کم۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ فارسی زبان میں تعبیر و تعلیل کی ... گنجائش ہے، دوسرے یہ کہ فارسی میں ترکیب اضافی و توصیفی کی وجہ سے نہایت تنوع کے ساتھ بڑے وسیع مفہوم کو بھی ... الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے برخلاف اس کے اُردو اپنے حروف روابط و اشارہ، صلہ و ضمیر کی وجہ سے اتنی گرانبار ہے کہ شوخی ... ان کی نذر ہو جاتا ہے۔

... فارسی میں جہاں صرف ایک حرف کی حرکت سے کام نکلتا ہے۔ اُردو میں اس کے لئے پورا لفظ لانا پڑتا ہے۔ مثلاً اُردو میں اضافت ... کا، کی، کے لانا ضروری ہے۔ لیکن فارسی میں صرف زیر کی حرکت سے یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ضمائر و اسماء اشارہ ... اُردو میں پورا لفظ (یہ۔ وہ۔ میں۔ تم۔ ہمارا۔ تمھارا) استعمال کرنا لازم ہے لیکن فارسی میں صرف ایک حرف سے یہ مفہوم ... ہے۔

... فارسی نحو میں اختصار کی بڑی گنجائش ہے جو اُردو میں نہیں اور اسی لئے غالب کی ظرافت و شوخ نگاری اُردو میں ... پہونچ سکی۔ تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ غالب نے اُردو میں بھی کافی شوخ نگاری سے کام لیا ہے اور اس خصوصیت کے ... اس میں بازاری پن کا کہیں نام نہیں۔ اُردو کے دوسرے بڑے بڑے شعراء (میر، ذوق، سودا، انشاء، ناسخ، ... داغ وغیرہ) کے یہاں بھی طنز و ظرافت کا عنصر نظر آتا ہے، لیکن کبھی کبھی سوقیانہ حد تک پہونچ جاتے ہیں ___ غالب نے ... شاہد باز ہونے کے کبھی شرافت و تہذیب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ نہ اُردو میں نہ فارسی میں ___ اُردو میں غالب

کی اس متین و شائستہ شوخی و ظرافت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا
بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں — کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا — ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو
کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

ان کے یہاں مشکل ہی سے دو چار اشعار ایسے مل سکیں گے جنھیں ہم نامناسب شوخی کی مثال میں پیش کر سکیں یا جو ذوق پر گراں ہوں مثلاً:-

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی — آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

غالب کی ظرافت کی یہ خصوصیت کہ کبھی کبھی اس میں شدید تلخی غم بھی شامل ہوتی ہے، شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمایئے:-

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

یہ اشعار محض شوخی و ظرافت نہیں بلکہ ان میں تلخی غم و بیچارگی عشق کا شدید احساس بھی پایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ قوت صبر و تحمل کا [illegible]

…ب غالب

جن حضرات نے کلام غالب کا غائر مطالعہ کیا ہے، اُن سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ اس کے کلام کا ایک خاص "آہنگ" ہے، جو حسن تعبیر، ندرت تمثیل، جدت ادا و خوشی بیان کے امتزاج سے پیدا ہوا …لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کے اس "آہنگ" کے دلکش ہونے کا سبب صرف اس کی قدرت زبان و بیان ہے۔ …اس کے اشعار کسی ایسے ایرانی کے سامنے پڑھئے جو غالب سے واقف نہیں، تو وہ کبھی نہ سمجھ سکے گا کہ کسی "ہندی نژاد" کا …ہے۔ وہی محاورات، وہی ترکیبیں، وہی الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور وہی بے ساختہ پن جو کسی خوش ذوق ایرانی شاعر کے کلام میں …سکتا ہے، اس کے یہاں بھی ہے۔

عرفی کا ایک شعر ہے:-

خوش آنکہ پیش تو پرسند حال عرفی داد　　فغانے بہ کنایت ز روزگار کند

زبان، انداز بیان و مفہوم کے لحاظ سے کتنا پاکیزہ شعر ہے۔ غالب اسی چیز کو یوں پیش کرتا ہے:-

دوش کز گردش بختم گلہ بر روئے تو بود　　چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

غالب کے شعر میں یقیناً ربودگی کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو عرفی نے "پیش تو پرسند" سے پیدا کی ہے، لیکن شوخی اور لطف بیان …سے بہتر ہے۔

نظیری کی بہت مشہور غزل ہے، چاکش نگر، پاکش نگر۔ اس میں نظیری نے اپنے محبوب کی تصویر کھینچی ہے اُس عالم کی جب وہ …ر کا فریفتہ ہوتا ہے۔ لکھتا ہے:-

چشمش براہے میرود مژگان نمناکش نگر　　در سینہ دارد آتشے پیراہن چاکش نگر
دامے کہ از زلف انداختہ در گردن صیدش ببیں　　خونے کہ مژگاں ریختہ، بر دامن پاکش نگر
شرم از میاں برخاستہ مُہر از زباں برداشتہ　　گفتار بے ترسش ببیں رفتار بیباکش نگر
از کوئے معشوق آمدہ شوریدگاں در حلقہ اش　　از صید آہو میرسد شیراں بفتراکش نگر

غالب نے بھی اسی زمین میں اسی مفہوم کی ایک غزل لکھی ہے۔ بعض ہم قافیہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

در گریہ از بس تازگی رخ ماندہ بر خاکش نگر　　واں سینہ سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر
برقے کہ جانہا سوختے دل از جفا سردش ببیں　　شوخی کہ خونہا ریختے دست از حنا پاکش نگر
آں سینہ کز چشم جہاں مانند جاں بودے نہاں　　اینک بہ پیراہن عیاں از روزنِ چاکش نگر
بر مقدم صید افگنی گوشے بر آوازش ببیں　　در بازگشت از توسنے چشمے بفتراکش نگر

اس میں شک نہیں کہ نظیری نے بیباک کے قافیہ میں اتنا اچھا شعر لکھا کہ غالب کو یہ قافیہ ترک کر دینا پڑا، لیکن اسی کے مقابلہ میں …قافیہ میں وہ نظیری سے بڑھ گیا۔ نظیری کے یہاں دامن کو پاک کہنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

"دست از حنا پاکش" علاوہ اپنی ترکیب کے مفہوم شعر کے لحاظ سے اتنا چست و برمحل استعمال ہوا ہے کہ نظیری کا شعر …گیا۔

…فتراک کے قافیہ میں نظیری اور غالب دونوں نے محاکات سے کام لیا ہے، اور دونوں کا پلہ برابر ہے۔

مطلع میں دونوں نے محبوب کی عاشقانہ بے تابی کا اظہار کیا ہے، لیکن نظیری کے یہاں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے یہ حالت محبوب کے لئے مخصوص ہو جائے، غالب نے "از بس تازگی" کہکر اس کمی کو پورا کر دیا، علاوہ اس کے تازگی کی شدت بھی غالب کے کے شعر میں زیادہ ہے۔ ان قافیوں کے علاوہ دوسرے قوافی بھی غالب نے نظم کئے ہیں، جن میں تریاک اور ادراک اس کا حصہ ہوگیا ہے۔ ملاحظہ ہوں:-

ناگشتہ خود لذت پذیر شنو تلخ ست بر لب خندہ اش　　زہرے کہ پنہاں می خورد پیدا ز تریاکش نگر
خواند بہ امید اثر اشعار غالب ہر سحر　　ز نکتہ چینی در گزر فرہنگ و ادراکش نگر

زبان کے لحاظ سے دونوں غزلیں اتنی یکساں ہیں کہ کوئی ایرانی بھی ان میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

ایک اور زمین ہے:- "بندست، پیندست" جس میں عبدالرحیم خانخاناں اور نظیری دونوں کی غزلوں کا مقابلہ مولانا شبلی نے شعر العجم میں کیا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ خانخاناں کی غزل اپنی کیفیت تغزل کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتی اور نظیری کا ایک شعر بھی اس قابل نہیں کہ خانخاناں کی غزل کے ساتھ ساتھ پڑھا جائے۔

اسی زمین میں غالب کی بھی غزل ہے، جو خانخاناں تو نہیں، لیکن نظیری کی غزل سے یقیناً مرجح حیثیت رکھتی ہے۔ نظیری کے یہاں الوند اور فرزند کے قافیے تو یکسر آورد و تصنع ہیں۔ اس لئے ان کا ذکر بیکار ہے، البتہ دوسرے قوافی میں غالب و نظیری کا تقابل لطف سے خالی نہیں۔

شکر خند کے قافیہ میں دونوں کی فکر ملاحظہ ہو:-

نظیری	غالب
درازدستی حسن کہ گل بہ چشم ریخت	نگاہ مہر بدل سر نداد جشنِ نوشش
کہ تا بدامنم از جیب در شکر خندست	ہنوز عیش باندازۂ شکر خندست

نظیری لکھتا ہے کہ کس حسن کی درازدستی نے میری نگاہ کے سامنے پھول ہی پھول کھلا دئے ہیں کہ جیب سے لے کر دامن تک شکر خند نظر آتا ہے۔

"شکر خند" تبسم کو کہتے ہیں، اس لئے نظیری کے دوسرے مصرعہ میں پہلے مصرعہ کے لحاظ سے بیان میں تنزل پیدا ہوگیا ہے، جو معنوی نقص سے خالی نہیں۔ برخلاف اس کے غالب نے شکر خند کے اصلی مفہوم سے شعر کو باہر جانے نہیں دیا۔ وہ کہتا ہے کہ باوجود محبوب کے التفات کے بھی پوری مسرت مجھے حاصل نہیں اور اس وقت تک میرا عیش تبسم کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔

ایک اور شعر:-

نظیری	غالب
بہ حرف اہل غرض قرب بعد ما بندست	درازدستی من چاک ار فگند چہ عیب
دل شکستۂ ما را ہزار پیوندست	ز نوپشی، دلق ورع با ہزار پیوندست

نظیری کا پہلا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا ہے اور غزل کی زبان کے لئے جو سلاست و روانی چاہئے وہ اس میں نہیں پائی جاتی

ہر چہ از گریہ فشاندیم بہ نشمردن ریخت   ہر چہ از نالہ رساندیم بہ نشنودن رفت

بادہ بہ غم خوردن عاشق معاف داشت   آنرا کہ دل ربودن و نشناختن بسے ست

تاثیر آہ و نالہ مسلم ولے مترس   ما را ہنوز عربدہ با خویشتن بسے ست

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است   بردار تواں گفت، بہ منبر نتواں گفت

پایم از گرمی رفتار ہمی سوخت براہ   در قدم سوختن خار بپایانم سوخت

بہ بانگ صور سر از خاک بر نمی دارم   ہنوز در نظرم چشم نیم خوابے ہست

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گذرد   زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گذرد

در نگاریں روضۂ فردوس نگشاید دلش   آنکہ او چیند در دیغ راست مانندش بود

مسکیں خبر از لذت آزار ندارد   خارم کش و در رہگذر چارہ گرم ریز

ہر برق کہ نظارہ گداز ست نہادش   بگداز و بہ پیمانۂ ذوق نظرم ریز

نازد مہرت کہ غالب بمردن ہمی راضی   حسرت گردم تو سیدائی کہ مردن نیست دشوارش

بادہ بہ دام خوردہ و زر بقمار باختہ   وہ کہ زہر چہ ناسزاست ہم بسزا نہ کردہ ایم

تا بچہ مایہ سر کشیم نالہ بعذر بے غمی   از نفس انچہ داشتیم صرف ترانہ کردہ ایم

خار ز جادہ باز چیں سنگ بہ گوشہ در فگن   در سر رہ گذشتنش ترک سپاہ کردہ ایم

با تو عرض وعدہ ات حاشا کہ از ابرام نیست   ہر چہ می گوئی ہمی خواہم کہ تکرارش کنم

اختلاط شبنم و خورشید تاباں دیدہ ام   جرأتے باید کہ عرض شوق دیدارش کنم

کردہ ام ایمان خود را دستمزد خویشتن   می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم

چشم بد دور التفاتے در خیال آوردہ ام   ہر چہ دشمن می کند با دوست نسبت می کنم

آخر نبودہ ایم در اول خدا پرست   با ما ز سادگی ست اگر بدگماں نئی

دانستہ کہ عاشق زارم گدا نیم   دانم کہ شادئی، شوخ گیتی ستاں نئی

غالب کی بعض غزلیں ایسی ہیں جو مطلع سے لے کر مقطع تک مرصع ہیں اور کسی شعر کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مثلاً:۔

چوں زبانہا لال و جانہا پر ز غوغا کردۂ   ہایت از خویش پرسید انچہ ما کردۂ

گر نئی مشتاق عرض دستگاہ حسن خویشتن   جاں فدایت دیدہ را بہر چہ بینا کردۂ

ہفت دوزخ در نہاد شرمساری مضمرست   انتقام ست انکہ با مجرم مدارا کردۂ

صد کشاد آنرا کہ ہم امروز رخ بنمودۂ   مژدہ باد آنرا کہ محو ذوق فردا کردۂ

ذرہ را روشناس صد بیاباں گفتۂ   قطرہ را آشنائے ہفت دریا کردۂ

دجلہ می جوشد نہاں دیدہ را جز یائے نیست   شعلہ می بالد نگر در سینہ جا کردۂ

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہرست   خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ

اس کے غالب کا پورا شعر سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور شوخی کی لطافت تو خیر ظاہر ہی ہے۔

مقطع میں دونوں نے ایک ہی قافیہ استعمال کیا ہے:۔

نظیری

نظیری از تو بجاں کندنست لب بکشائے   ازیں قدر کہ بگوئی "بمیر" خورسندست

غالب

نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب   بدیں کہ پرسد و گوئند "ہست" خورسندست

نظیری کہتا ہے کہ حالت جاں کنی کی ہے اور اگر اس وقت تو اتنا بھی کہدے کہ "مرجا" تو میری خوشی کے لئے کافی ہے۔
غالب کا شعر مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے، وہ کہتا ہے کہ "میں اہلِ دُنیا سے وفا کا طلبگار نہیں، اگر وہ میرے سوال کے ... صرف اتنا ہی کہدے کہ "وفا کا وجود ہے" تو میں اسی پر خوش ہوں۔ غالب نے جس خوبی سے اپنی وفا کی طرف کنایہ ... اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ "آرزومند" کے قافیہ میں خانخاناں نے قیامت کا شعر کہدیا تھا:۔

شمار شوق نہ دانستہ ام کہ تا چندست   جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومندست

اور اسی لئے نظیری کو یہ قافیہ لینے کی ہمت نہ ہوئی۔ غالب نے البتہ اس قافیہ میں ایک شعر لکھا ہے اور بالکل نئے زاویہ سے

زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی   نگوید ارچہ بمرگ من آرزومندست

محبوب میری موت تو چاہتا ہے لیکن اس کا اظہار اس لئے نہیں کرتا کہ کہیں مجھے شادی مرگ نہ ہوجائے اور فرطِ مسرت ... موت اسے منظور نہیں۔

چند کا قافیہ خانخاناں اور نظیری دونوں کے یہاں نہیں پایا جاتا، لیکن غالب نے اس کا استعمال نہایت لطیف شوخی ... کیا ہے:۔

نہ گفتۂ کہ بہ تلخی بساز و چند بزی   بیر کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں چندست

اب ہم اس کے چند اشعار مختلف رنگ کے پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ بے ساختہ پن، سلاست و حلاوت، ... اور چستی بندش کے لحاظ سے اس کا ذوق کتنا بلند و لطیف تھا:۔

از بسکہ خاطر ہوس گل عزیز بود   خوں گشتہ ایم و باغ و بہار خودیم ما

در کار ماست نالہ و ما در ہوائے او   پروانۂ چراغ مزار خودیم ما

شکست رنگ تو از عشق خوش تماشائیست   بہار دہر بہ رنگینیٔ خزان تو نیست

دریں روش بچہ امید دل تواں بستن   میانۂ من و او شوق حایل افتادست

چو اندر آئینہ با خویش لابہ سازشوی   زخود بجوئے کہ مارا چہ در دل افتادست

بے جمال تو بتاراج نظرہا گستاخ   وے خرام تو بپامالی سرہا گستاخ

زما گسستی و با دیگراں گرو بستی   بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا

تو زود مستی و مارا ز داد بجوئے تو ایم   خراب درکش و پیمانہ کن حوالۂ ما

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا   بہ کم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

دیدہ می گرید، زباں می نالد و دل می تپد
عقدہا از کارِ غالب سربسر وا کردۂ

اس غزل کا پہلا، دوسرا، چوتھا اور چھٹا اور آخری شعر بالکل اسی رنگ کا ہے، جو تغزل کے لئے فارسی شاعری کا تیسرے
خصوص تھا۔ تیسرے شعر میں غالب نے اپنی اسی جدت بیان سے کام لیا ہے، جو غالب کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے،
"مجرم کے ساتھ لطف و مدارا سب سے بڑا انتقام ہے کیونکہ اس طرح جو شرمساری اُس پر طاری ہوتی ہے وہ ایسی
وہ چیز ہے کہ عذاب دوزخ بھی اس کے سامنے کچھ نہیں"۔
ساتواں شعر بھی ابداع بیان کی بڑی پاکیزہ مثال ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مضمون نیا نہیں ہے، تصوف کا ذوق رکھنے
والوں کے یہاں بکثرت نظر آتا ہے، لیکن غالب نے پہلے مصرعہ میں "جلوہ و نظارہ" کو "از یک گوہر ست" کہکر اس مضمون
شگفتہ بنا دیا۔

غالب نے بعض غزلیں مسلسل بھی لکھی ہیں، اور بڑی دلکش و لطیف!

رفت آنکہ کسب بوئے تو از باد کردمے   گل دیدمے و روئے ترا یاد کردمے
رفت آنکہ گر براہ تو جاں دادمے ز ذوق   از موجِ گرد رہ، نفس ایجاد کردمے
رفت آنکہ گر ببت : بنفریں نواختے   رنجیدمے و عربدہ بنیاد کردمے
رفت آنکہ جانب رُخ و قدت گرفتمے   در جلوہ بحث باگل و شمشاد کردمے
اکنوں خود از وفائے تو آزار می کشم   رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمے
بندم منہ ز طرہ کہ تابم نماندہ است   رفت آنکہ خویش را بہلا شاد کردمے
آخر بداد گاہِ دگر او فتاد کار   رفت آنکہ از تو شکوۂ بیداد کردمے
غالب ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است   رفت آنکہ عزم خلخ و نوشاد کردمے

یعنی وہ زمانہ گیا جب ہوا سے تیری خوشبو حاصل کیا کرتا تھا اور جب کوئی پھول نظر آتا تھا تو تیری صورت سامنے آجاتی
وغیرہ۔ اب تو خود تیری وفا سے مجھے آزار پہنچتا ہے اور کسی دوسری درگاہ سے اتنا دل وابستہ ہو چکا ہے کہ یہ تیرے
کا شکوہ بھی اب کوئی معنی نہیں رکھتا۔

غالب نے یہ غزل غالباً اس وقت کہی ہے جب "زیارت کعبہ" کی خواہش اُس کے دل میں شدت سے موجزن تھی اور
کہ ایسی حالت میں غزل محض نعتیہ رنگ اختیار کر لیتی ہے جو بالکل پھیکا ہوا کرتا ہے، لیکن غالب نے جس خوبی سے
قائم رکھا ہے، اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ اگر آپ مقطع کو نکال دیں تو یہ واسوخت کے رنگ کی مسلسل غزل
ہے۔

غالب کی ایک اور غزل سنئے، جو تغزل کی تمام خصوصیات کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی:-

جنوں مستم بفصلِ نو بہارم می تواں کشتن   صراحی بر کف و گل در کنارم می تواں کشتن
بجرم ایں کہ در مستی بیاباں بردہ ام عمرے   بکوئے میفروشاں در خمارم می تواں کشتن

بہجراں زیستن کفر ست، خونم را دیت نبود   چراغ صبح گاہم آشکارم می تواں کشتن
تغافلہائے یارم زندہ دارد ورنہ در بزمش   بجرم گریۂ بے اختیارم می تواں کشتن
منت معذور دارم لیکن اے نامہرباں آخر   بدیں جان و دلِ امیدوارم می تواں کشتن
بخونِ من اگر ننگ است دست و خنجر آلودن   نوید وعدۂ از انتظارم می تواں کشتن
خدا یا از عزیزاں منت شیون کہ برتابد   جدا از خاکداں دور از دیارم می تواں کشتن

گرنخم یار باشد بے نیاز از کشتنم غالب
بدرد بے نیاز یہائے یارم می تواں کشتن

ایک دو غزلیں اور ملاحظہ ہوں:-

فغاں کہ برق عتاب تو آنچنانم سوخت   کہ راز در دل و مغز اندر استخوانم سوخت
شنیدۂ کہ بآتش نسوخت ابراہیم   ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت
مراد مید بن گل در گماں فگند امروز   کہ باز بر سر شاخ گل آشیانم سوخت
مگر پیام عتابے رسیدہ است از دوست   شکستہ رنگی یاران راز دانم سوخت
خبر دہید بعنائل کہ ہجری گشتم   ز ماہتاب چہ منت برم کتانم سوخت

نہ موج گل نوید تماشائے کیستی   انگارۂ مثال سراپائے کیستی
بیہودہ نیست سعی صبا در دیارِ ما   اے بوئے گل پیام تمنائے کیستی
خوں گشتم از تو باغ و بہار کہ بودۂ   کشتی مرا بغمزہ مسیحائے کیستی
نشنیدہ لذت تو فرو میرود بدل   اے حرف مو لعل شکر خائے کیستی
از ہیچ نقش غیر نکوئے ندیدۂ   اے دیدہ محو چہرۂ زیبائے کیستی
با ہیچ کافرے دہیمہ سختی نمی رود   اے شب برگ من کہ تو فردائے کیستی

غالب نوائے کلک تو دل می برد ز دست
تا پردہ سنج شیوۂ انشائے کیستی

بیاد جوشش تمنائے دیدہ ام بنگر   چو اشک از سر مژگاں چکیدہ ام بنگر
زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی   بیا بخاک من و آرمیدہ ام بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامیدم   ندیدن تو شنیدم، شنیدہ ام بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیاں گم شد   بہ انتظار ہما دام چیدہ ام بنگر
اگر ہوائے تماشائے گلستاں داری   بیا و عالم در خوں تپیدہ ام بنگر

غالب — ولی بادہ خوار

(... فتحپوری)

غالب کا خیال تھا کہ مسایل تصوف صرف ایک ولی ہی بیان کرسکتا ہے، بشرطیکہ وہ ولی ہو، اور ولی بادہ خوار نہیں ہوسکتا۔

یہ مسایل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب نے دونوں باتیں غلط کہیں۔ کیونکہ نہ یہ ضروری ہے کہ مسایل تصوف صرف ایک ولی ہی بیان کرسکے اور نہ بادہ خواری کو ولایت مستلزم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص ولی نہ ہونے کے باوجود مسایل تصوف بیان کرسکے اور بادہ خوار ہونے کے باوجود ... کہا جاتا ہے کہ اس شعر کو سُن کر غالب کے ایک دوست نے کہا کہ "اگر تم بادہ خوار نہ ہوتے تو ہم تمھیں تب بھی ولی نہ سمجھتے" ... یہ سُن کر غالب نے ظریفانہ انداز میں کہا کہ :- "تم تو شاید مجھے اب بھی ولی نہ سمجھتے ہو"۔

... بات دراصل یہ ہے کہ غالب نہ ولی تھا نہ اسے تصوف کا کوئی خاص ذوق، بلکہ وہ محض بادہ خوار شاعر تھا جس کا احساس ... اور یہی چور اس کے دل میں تھا جس نے اس سے "جو نہ بادہ خوار ہوتا" کہلوایا۔ اس کے ذہن میں ولی کا مفہوم صرف ... تھا کہ وہ مسایل تصوف بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہو، بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اُسے پابند شریعت ہونا چاہئے اور بادہ خواری ... خلاف شریعت سمجھتا تھا۔

غالب کا زمانہ ولیوں کا زمانہ تو نہ تھا، لیکن چونکہ دلی کے جوار میں بہت سے اولیاء مدفون تھے، ان کے مزاروں پر معتقدین جاتے ...، علاوہ اس کے یہ زمانہ دلی کی تباہی اور عوام کی مصیبت و پریشانی کا تھا، اس لئے ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے تصوف ... ڈھونڈھا جاتا تھا ہوسکتا ہے کہ ان میں بعض صاحب حال بھی رہے ہوں گے لیکن زیادہ تر صاحب قال تھے اور ان سب کے پاس یہی ایک ... وسیلوں کے مقابلہ کا رہ گیا تھا۔

غالب بھی انھیں صاحب قال لوگوں میں تھا۔ میں اسے صاحب حال اس لئے نہیں کہتا کہ مسایل تصوف سے زیادہ اس نے ... دنیوی مصائب کا ذکر کیا ہے جو اہل دل کا شیوہ نہیں۔ اس زمانہ کے شاعروں میں درد البتہ صاحب حال تھے، سو آپ دیکھیں گے ... کے کلام میں غالب کی سی آہ وزاری کا کہیں پتہ نہیں۔

لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ غالب نے بہت سے نکات تصوف کا ذکر مختلف انداز بیان سے کیا ہے۔ اس کا سبب ایک ... غالب نے بیدل کا غایر مطالعہ کیا تھا اور کلام بیدل کی اس خصوصیت نے کہ کوئی اسے سمجھے یا نہ سمجھے اس کا اثر ضرور قبول کرلیتا ... کو بھی کافی متاثر کیا تھا، دوسرا سبب یہ تھا کہ غالب کے زمانہ میں تصوف نام تھا صرف چند مخصوص الہیاتی نظریوں کا جن میں ... الوجود" کو خاص فلسفیانہ اہمیت حاصل تھی، اس لئے غالب کو اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی، کیونکہ وہ طبعاً فلسفیانہ دل و

دماغ لے کر آیا تھا اور اس طرح اس کا ذوق دقت آفرینی اور دشوار نگاری بھی پورا ہوجاتا تھا۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اس کے تمام حکیمانہ اشعار بے مغز و بے کیف ہیں، کیونکہ بعض بعض جگہ وہ محض اپنے فکر و تخیل کی رسائی سے خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے۔

ذیل کے اشعار سے اس کے یہ دونوں رنگ بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

۱- از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ — طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

کائنات میں ہر جگہ دل ہی دل ہے یعنی معمورۂ دل کے سوا وہ کچھ نہیں اور دل بھی وہ جو آئینہ کی طرح شفاف و روشن ہو اس لئے انسان کی حالت یہاں اس طوطی کی سی ہے جسے ہر طرف آئینہ ہی آئینہ نظر آتا ہے۔ اور اس آئینہ خانہ میں وہ ہر جگہ اپنا ہی عکس دیکھتی ہے

خیال اچھا، الفاظ اچھے اور بظاہر بات بھی اچھی، لیکن تصوف کے گداز کا کہیں پتہ نہیں۔

درد نے بھی کائنات کی اسی معموری کا ذکر کیا ہے لیکن طرز بیان و لب و لہجہ سے ایک دنیائے گداز پیش کردی ہے۔

آہستہ سے چل میان کہسار — ہر سنگ، دکان شیشہ گر ہے

غالب کے یہاں الفاظ ہی الفاظ ہیں کیفیت کا پتہ نہیں، لیکن درد کے یہاں کیف و جذبہ بھی ہے اور بیان کی وہ سادگی بھی جو صداقت جذبات کے اظہار کے لئے ضروری ہے۔

۲- غالب نے بعض اشعار تصوف کے ایسے سپاٹ لکھے ہیں کہ ان کو غالب سے منسوب کرنے کو جی نہیں چاہتا، مثلاً :-

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

یہ خیال غالب نے بیدل سے لیا ہے :-

صورت وہمے بہ ہستی متہم داریم ما — چون حباب آئینہ بر طاق عدم داریم ما

بیدل کے اسی شعر کی تفسیر غالب نے اپنے ان دونوں شعروں میں کی ہے، لیکن بالکل مکتب کے ملاؤں کی طرح — تصوف واقعات کا اظہار نہیں بلکہ مفروضات کو واقعہ کے رنگ میں پیش کرتا ہے، تصوف نام دو اور دو چار کا نہیں، بلکہ اس احتمال کا کہ دو اور دو چار سے کم اور زیادہ بھی ہوسکتے ہیں، سو یہ مقصود دو ٹوک بات کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

۳- قریب قریب اسی انداز کا ایک شعر غالب نے اور لکھا ہے :-

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ — کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

بالکل قوالی کی سی چیز ہے جو ڈھولک ہی پر اچھی معلوم ہوسکتی ہے۔ اس میں نہ کوئی بیان کی خوبی ہے، نہ معنی کی بلندی۔

۴- جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حق کی تکرار نہ ہو تو شعر بالکل بے لطف ہے، معنی کے لحاظ سے اس میں کوئی ندرت نہیں۔

۵- نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کہا جاتا ہے کہ غالب نے اس شعر میں "وحدتِ وجود" کا صوفیانہ عقیدہ پیش کیا ہے، لیکن نہایت پامال وجیش پا افتادہ
ے، جس میں عدم اور خدا دونوں کو ایک ہی سطح پر جمع کر دیا گیا ہے۔
"وحدتِ وجود" کا اصطلاحی مفہوم سادہ زبان میں یہ ہے کہ ہر چیز میں خدا جلوہ گر ہے۔ خیر یہاں تک تو کوئی مضائقہ
لیکن اس میں اس قدر غلو سے کام لینا کہ عدم کو بھی خدا سمجھ لیا جائے، بالکل بے معنی سی بات ہے۔

۶۔ برروئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے   اب امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

کیوں نہیں رہا؟ اس کا ثبوت پیش نہیں کیا۔ آئینہ میں جو چیز جیسی ہے ویسی ہی نظر آئے گی، اگر ناقص ہے تو ناقص
ل ہے تو کامل۔

۷۔ غالب نے بعض صوفیانہ اشعار ایسے بھی لکھے ہیں جو سپاٹ تو نہیں ہیں، لیکن حسن تاویل ان میں نہیں پایا جاتا

سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

آئینہ کی پشت پر پارہ پھیلا کر اسے منجلی کیا جاتا ہے۔ یہاں تک توجیہات معقول ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں کنایۃً اسکو
رار کہنا بالکل بے محل و خلافِ واقعہ ہے کیونکہ پارہ اسی وقت آئینہ میں انجلاء پیدا کرتا ہے جب اس کی بے قراری ختم
ہے اور پشتِ آئینہ میں پھیل کر وہ ایک جگہ قایم ہو جاتا ہے۔

۸۔ بسلسلۂ تصوف نگاری غالب کے فارسی کلام میں بھی ایسے بے نمک اشعار ملتے ہیں لیکن کم، اور اس کا سبب
اگر فارسی اشعار میں کوئی معنوی ندرت نہیں ہوتی تو کم از کم خوبیٔ زبان تو ہوتی ہی ہے اور اس لطف میں۔۔۔ کی طرف ہم
گاہ نہیں کرتے۔
لبتہ جہاں جہاں وہ بیدل کا تتبع کرتا ہے وہاں بے شک ساری قلعی کھل جاتی ہے اور محض "طبل بلند بانگ" ہو کر رہ جاتا ہے

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمار دلبری   در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

دوسرا مصرعہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔
اسی زمین کا دوسرا شعر ہے :-

رشک ملک چہ و چرا ہو تو جو رہ نمی برد   بیہدہ در ہوائے تو می پرد از سبک سری

شعر دُہرا ہے : اچھا۔ لیکن اسی زمین میں جب وہ تقلید و تتبع سے ہٹ کر سامنے آتا ہے تو اس کا رنگ کچھ اور ہو تا ہے مثلاً

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو روئے نیست   در طلبت توان گرفت بادیہ را بہ رہبری

یعنی کیوں : تیری جستجو میں اپنا رہبر میں بیابان کو قرار دوں جس کے ہر ہر ذرہ کا رخ تیری ہی طرف ہے، اس کے بعد کے شعر میں وہ
لاک کھلا ہوا غالب نظر آتا ہے اور اس کی انفرادیت پر قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔

ہر کہ دل ست در برش داغ تو رو دیش بہل   آہ جہ بگیرے وجہ باز بری بہ داوری

یعنی کوئی ایسا نہیں جس کے پہلو میں دل ہو اور اس دل میں تیری محبت کا داغ یا نشان نہ پایا جائے، اس لئے بہت سا اگر
تو دل دے بھی دیا جائے تو بیکار ہے کیونکہ تو اپنے نشانِ ملکیت کی بنا پر تو اُسے بزور واپس لے سکتا ہے۔

اس غزل کے مقطع میں بھی غالب نے اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

بینی ام از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

یعنی اگر تو میرے ضمیر، میرے دل کی گہرائی تک پہونچ سکتا ہے تو دیکھ کہ میرا کیا عالم ہے، آگ کا ایک سیلاب ہے جو دل و جگر
میں موجیں مار رہا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا غالب کے اردو کلام میں بعض اشعار تصوف کے بہت سپاٹ ہیں اور یقیناً قابل اعتنا نہیں لیکن
میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ اس کے بعض اشعار جو سطحی نہیں ہیں، وہ بھی لطف و کیفیت سے معرا ہیں۔
ذیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
ہیں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا   میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی   ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا   جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
ہے نذرِ کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا   بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا   گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا   یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز   ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا
کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ   برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ
فنا تعلیم درسِ بیخودی ہے اس زمانے سے   کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا   کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر
برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی   ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم   لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں
کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے   برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے   داغ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

یہ تمام اشعار وہ ہیں جنھیں تمام مفسرین و شارحین مطالب تصوف و فلسفہ کا حامل قرار دیتے ہیں، لیکن انتہائی کوشش
کے بعد بھی جو مفہوم ہاتھ آتا ہے وہ مفروضات موہومہ کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی حیثیت بالکل jigsaw puzzle کی ہے

…مقصود صرف جوڑ بٹھانا ہوتا ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان سے دماغی ورزش تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن ذہنی تفریح یا احساس
…سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ محض الفاظ کی گرہیں ہیں کہ اگر آپ انھیں کھولنے میں کامیاب ہو جائیں تو بھی ان میں شکن بدستور
…ی ہے۔

…میں یہ سمجھتا ہوں بعض مسایل تصوف اپنے اندر کافی کشش رکھتے ہیں اور وہ دماغ کو فکر و تصور کے بڑی دلکش بلندی
…جاتے ہیں، لیکن صرف اسی صورت میں کہ ان خیالات کا Vehicle کوئی اسی دنیا کی چیز ہو، یعنی مجاز سے گزر کر
…کی طرف پہونچا جائے لیکن غالب کے ان اشعار میں مجاز سے بالکل ہٹ کر براہ راست حقیقت تک پہونچنے کی جو کوشش
…ہے وہ بازیگری اور Acrobatism تو یقیناً ہے لیکن کیف کا دور دور پتہ نہیں۔ حیرت ہے کہ غالب نے
…خود بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ:-

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

لیکن ان اشعار میں انھوں نے اس اصول کو ترک کر دیا۔ البتہ جہاں جہاں انھوں نے اس کی پابندی کی ہے اور عامۃ الورود
…و احساسات عامہ کی وساطت سے ان مسایل کو پیش کیا ہے وہاں نکھار بھی پیدا ہو گیا ہے اور کیفیت تصدیق و یقین بھی مثلاً

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ۔۔۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اس شعر کا پہلا مصرع کچھ نہ تھا، لیکن دوسرے مصرع نے اسے سب کچھ بنا دیا۔

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے ۔۔۔ بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل ۔۔۔ جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں ۔۔۔ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

…یعنی یوں تو ہم بہت سے بت یا حجابات توڑ چکے ہیں، لیکن خود ہمارا بت یا انا سب سے بڑا سنگ گراں ابھی تک موجود ہے،
…لئے اصل بت شکنی دراصل نام ہے "خود شکنی" کا اور یہ آسان نہیں۔

…خیال، زبان و انداز بیان کے لحاظ سے یہ شعر بیان تصوف میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:-

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود ۔۔۔ قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں
ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر ۔۔۔ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ۔۔۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیمروز ۔۔۔ آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں ۔۔۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

…ان اشعار میں اکثر ایسے ہیں جنھیں ہم مجاز کی شاعری نہیں کہہ سکتے، لیکن چونکہ ان کی زبان، ان کا لب و لہجہ وہی ہے
…شاعری میں بھی ہماری نظر سے گزرتا رہتا ہے، اس لئے ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن اس سلسلہ

میں پھر غالب کی وہی کہی ہوئی بات سامنے آجاتی ہے کہ:- "فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ" اور اس میں شک
نہیں اس نقشہائے رنگ رنگ میں اس کا نقش تصوف بھی بڑا دلکش بڑا حسین اور بڑا عظیم نظر آتا ہے۔

کلیات میں پہلا شعر حمد ہی کا ملاحظہ فرمایئے:-

اے بہ خلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا ۔۔۔ با ہمہ در گفتگو بے ہمہ در ماجرا

تمام دوسرے صوفی شعراء کی طرح غالب نے بھی اس میں خدا کی "وحدت وجود" ہی کا ذکر کیا ہے لیکن الفاظ کے
انتخاب، ان کی نشست، لب و لہجہ کی متانت، اور اسی کے ساتھ آفاقی قسم کے تنزیہی آہنگ نے خدا کی شوکت و جبروت
اور عظمت و جلال کا اظہار جس انداز سے کیا ہے اس کی نظیر مشکل ہی سے دوسری مل سکتی ہے۔

یہ غزل پوری کی پوری اسی رنگ کی ہے اور اس کا ہر شعر اسی خیال کا تدریجی ارتقاء ہے۔ گویا غالبؔ "فضائے قدس"
کو متحیرانہ دیکھ رہا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہے اور کیونکر اپنے صحیح تاثرات کا اظہار کرے، ایک جوش ہے جو
کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا، ایک سیلاب ہے جو برابر بڑھتا ہی جاتا ہے — ملاحظہ ہو:-

آب نہ بخشی بہ زور، خون سکندر ہدر ۔۔۔ جاں نہ پذیری بہ ہیچ فقد خضر ناروا

آب حیات کی جستجو میں سکندر کی ناکامی اور خضر کی حیات دوام مشہور روایات ہیں اور تمام شعراء نے ان تلمیحات کا
استعمال مختلف انداز میں کیا ہے۔ لیکن غالب نے حمد کے سلسلہ میں جس رخ سے ان کا ذکر کیا ہے، وہ غالب ہی کا حصہ تھا۔
کہتا ہے کہ تیری شان بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ آب حیات کی طلب میں سکندر کا خون بھی تیرے یہاں حلال ہے اور خضر کی طرف
سے جان ایسی عزیز چیز پیش بھی تجھے منظور نہیں۔

اسی خیال کا اعادہ زیادہ شاعرانہ انداز میں ملاحظہ فرمایئے:-

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب ۔۔۔ ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

تیری بے نیازی کا یہ رنگ ہے کہ بوتراب (حضرت علی) کی خستگی و ناکامی اور حسین کی سرگزشت خونیں بھی گویا بزم بے نیازی کی
رونق ہے اور تیرے ساز استغنا کا آہنگ زیر و بم —!

تصور احدیت کے لئے موجودات کی کشمکش کی طرف سے آنکھ بند کر لینا، صوفیہ کے یہاں ضروری ہے۔ چنانچہ رومیؔ کہتے ہیں:-

لب ببند و گوش بند و چشم بند

غالب اسی خیال کو بیدلؔ کی زبان میں اس طرح ظاہر کرتا ہے:-

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن ۔۔۔ ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

ایک جگہ جستجوئے حق کی سرگرمی میں غالب اپنی ناکامی کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

رہرو تفتہ و رہ رفتہ بہ آہم غالب ۔۔۔ توشہ بر لب جو ماندہ و نشان ست مرا

تصور کیجئے کہ ایک مسافر شدید گرمی کے زمانہ میں کسی دریا کے کنارے پہونچ جاتا ہے اور انتہائی تشنگی کے عالم میں اپنا تمام زاد راہ

ساحل پر چھوڑ کر پانی کے اندر کود پڑتا ہے اور پھر نہیں ابھرتا، لوگ آکر اس کے زادِ راہ یا توشہ کو دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے
پوچھتے ہیں کہ وہ بدنصیب کون ہے جو دریا کے کنارے اپنا سارا سامان چھوڑ کر غائب ہوگیا ہے اور پھر موجوں کے تلاطم کو دیکھ کر
تے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اور وہاں سے گزر جاتے ہیں۔
غالب کہتا ہے کہ میرا حال بھی اسی بدنصیب مسافر کا سا ہے جو خود تو پانی میں ڈوب مرا ہے لیکن توشہ کی صورت میں
سامان چھوڑ گیا ہے اور کسی کو خبر نہیں کہ وہ ڈوب جانے والا کون تھا۔
یہ شعر غالب کے ان چند اشعار میں سے ہے جن کو میں بکھرا ایہامی کہتا ہوں اور جس کی مثال فارسی کے بڑے بڑے شعراء
میں بھی ہم کو مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔
میں سمجھتا ہوں کہ آتش نے غالب کے اسی خیال سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا:

میں اس جہان میں وہ چوبِ خشکِ صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

اس رنگ سے ہٹ کر دوسرے رنگ میں غالب کے چند اشعار تصوف ملاحظہ ہوں:

آں راز کہ در سینہ نہان ست نہ وعظ است بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

کیا لطیف اشارہ ہے منصور کے دعوائے انا الحق کی طرف۔

ہم از احاطۂ قُدست اینکہ در جہاں مارا قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ قُدست

یہ شعر بھی وحدت وجود کا ہے اور اس خیال کو غالب نے بڑے لطیف انداز سے پیش کیا ہے، کہتا ہے کہ ہر چند میرا قدم
بتکدہ میں ہے لیکن سر تیرے ہی آستانہ پر جھکا ہوا ہے، کیونکہ تو تمام عالم پر محیط ہے اور وہ کعبہ ہو یا بت خانہ، تیرے ہی
سے معمور ہے۔
اسی خیال کو وہ دوسری جگہ ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:-

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

گر فراموشی بہ فریادم رسد وقت ست وقت رفتہ ام از خویشتن چندانکہ در یادِ خودم

یعنی میں اپنے آپ سے تو گزر گیا ہوں، لیکن ابھی تک اپنے آپ کو بھولا نہیں، اس لئے چاہتا ہوں کہ فراموشی کامل مجھ پر
طاری ہو جائے میں اپنے آپ کو بھی بھلا دوں۔
اسی خیال کو وہ اس سے زیادہ لطیف انداز میں یوں ظاہر کرتا ہے:

ہر قدم نخے ز خود رفتن بود در بارِ من ہمچو شمعِ بزم در راہِ فنا زادِ خودم

یعنی جس طرح شمع آہستہ آہستہ گھل کر فنا ہو جاتی ہے اور اس گھلنے کا سبب بھی وہ خود آپ ہے، اسی طرح میں بھی

ہر قدم پر اپنے آپ سے دور ہوتا جا رہا ہوں

چند غزلیں غالب نے ایسی بھی لکھی ہیں، جن کے اکثر اشعار ایک ہی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسی غزلوں میں دو ایک
حمد کی بھی ہیں۔ مثلاً:-

چوں ز راہ پیالہ دل و جاں بہ رُخ غا کردہ ای بایدت از خویش پرسید انچہ با ما کردہ ای

یہ خود اپنے ہی سے پوچھ کہ یہ تو نے کیا کر دیا جو کہ زبان تو میری گنگ ہے اور دل و جان ہنگامۂ شوق سے لبریز ہیں۔

گر نہ ای مشتاقِ عرضِ دستگاہِ حسنِ خویش جاں فدایت دیدہ را بہرِ چہ بینا کردہ ای

تو اگر اس کا مشتاق نہیں کہ دنیا تیرے متاعِ حسن کو دیکھے، تو پھر تو نے آنکھوں کو دیکھنے کی قوت ہی کیوں
عطا کی۔
بعض اشعار جو زیادہ سہل ہیں ملاحظہ ہوں:-

صد کشا و آنرا کہ ہم امروز رخ بنمودہ ای مژدہ باد آنرا کہ محوِ ذوقِ فردا کردہ ای
خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردہ ای بادرستاں گرد و از شبہائے پیدا کردہ ای
ذرہ را روشناس صد بیاباں گفتہ ای قطرہ را آشنائے ہفت دریا کردہ ای
دجلہ می جوشد بہانا دیدہ ہا جویائے تست شعلہ می بالد مگر در سینہ ہا جا کردہ ای
جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر ست خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردہ ای
صد کشا و آنرا کہ ہم امروز رخ بنمودہ ای مژدہ باد آنرا کہ محوِ ذوقِ فردا کردہ ای

اسی زمین میں ایک شعر خاص اس کے ذوق کا دیکھئے:

چشمۂ نوش ست از زہرِ عتابت کامِ جان تلخیٔ مے در مذاقِ ما گوارا کردہ ای

یعنی تو نے چشمۂ نوش میں زہرِ عتاب اسی لئے ملا دیا ہے کہ تو جانتا ہے میں شراب میں تلخی کا دلدادہ ہوں۔
ایک اور شعر نہایت ذہین حسنِ تعلیل کا ملاحظہ ہو۔

ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر ست انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردہ ای

مجرم و گناہگار کے ساتھ تیرا مدارا دراصل بڑا انتقام ہے کیونکہ اس طرح مجرم بے انتہا شرمسار ہوگا اور شرمساری بجائے
خود بڑا عذاب ہے۔

غالب کی ایک اور مسلسل غزل ہے جو بلحاظ جذبات و انداز بیان ایک خاص والہانہ کیفیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس کے
چند اشعار یہ ہیں جو حقیقت بھی ہیں اور مجاز بھی:-

اے موجِ گل نوید تماشائے کیستی انگارۂ مثال سراپائے کیستی
بیہودہ نیست سعیِ صبا در دیارِ ما اے بوئے گل پیامِ تمنائے کیستی

خوں گشتم از تو باغ و بہار کہ بودہ ای — کشتی مرا بہ غمزہ مسیحائے کیستی

نشنیدہ لذت تو فرد میرود بدل — اے حرف مو لعل شکر خائے کیستی

ایک رُباعی میں وہ منصور کے دعوائے انا الحق وہمہ اوست کی تائید اپنے خاص انداز بیان میں اس طرح کرتا ہے :-

منصور عشق ز نکتہ چیناں چہ بود — در راست خطر ز ہم نشیناں چہ بود

چوں عاقبت یگانہ بیناں وارست — دریاب کہ انجام دو بیناں چہ بود

یعنی جب خدا کو یگانہ دیکھنے والوں کا انجام دار ہے تو معلوم نہیں ان کا انجام کیا ہوگا جو دوئی کے قایل ہیں۔

اس اقتباس سے آپ کو بہ آسانی معلوم ہو سکے گا کہ غالب کی متصوفانہ یا فلسفیانہ شاعری میں کوئی خاص بات ایسی
جسے ہم واقعی کسی اہل دل یا اہل حال کے تاثرات کا نتیجہ کہ سکیں۔ اس کا تصوف و فلسفہ ایک مستعار چیز تھا اور غالب
غالباً اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ بقول حزیںؔ "برائے شعر گفتن خوب ست" یا یہ کہ اس زمانہ کے محافل شعر و سخن میں
کی مانگ تھی اور غالب کے لئے ضروری تھا کہ ان مجالس میں درخور پانے کے لئے وہ اس رنگ کے اشعار بھی کہے۔
غالب کا اصل فن اس کی شوخ نگاری تھی، اس کی غیر معمولی رسائی ذہن تھی، انداز بیان کی ندرت تھی اور اس کی شاعری
خصوصیات اس کے ہر صنف سخن میں پائی جاتی ہیں۔

غالب کا نہانخانۂ ازل

(نیاز فتحپوری)

غالب نے ایک قطعہ میں ازراہِ افتخار ظاہر کیا ہے کہ اگر پچھلے شاعروں میں سے کسی کے شعر میں وہی مضمون پایا جائے جو
میں نے لکھا ہے تو

مبر گمان توارد یقیں شناس کہ دزد — متاع من ز نہانخانۂ ازل بُردست

یعنی اسے توارد نہ سمجھو بلکہ اسے یوں سمجھو کہ وہ دراصل میرا ہی مضمون تھا جو نہانخانۂ ازل میں، میں نے محفوظ کر دیا تھا
اور چور نے اسے اُڑا لیا۔

غالب نے یہ قطعہ کیوں کہا؟ — ظاہر ہے کہ اس کا سبب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ کسی نے اُن پر سرقہ یا توارد کا الزام لگایا
ہو اور انھوں نے جھنجھلا کر یہ قطعہ لکھا ہو۔

غالب کے متعلق یہ خیال کہ وہ کسی اور کے شعر سے سرقہ کر سکتا تھا، یقیناً کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ اس کے ہزاروں اشعار
میں سے جو اپنی جگہ بڑی قیمت رکھتے ہیں، اگر دس بیس اشعار ایسے مل بھی جائیں جن کا مضمون قدماء کے اشعار سے ملتا جلتا
تو اسے سرقہ نہیں کہ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ توارد کہ سکتے ہیں۔ لیکن غالب توارد کی نسبت بھی گوارا نہیں کرتا اور کافی خشونت
ساتھ وہ اس خیال کی تردید اس طرح کرتا ہے کہ اگر توارد ہوا بھی ہے تو اس کا مرتکب میں نہیں ہوں، بلکہ وہی شاعر ہے جو
مجھ سے پہلے ہی، میرے مضامین کو "نہانخانۂ ازل" سے چرا لایا تھا۔

یقیناً غالب نے ایسا کہنے میں انصاف سے کام نہیں لیا اور نہ یہ کوئی معقول بات ہے۔ کسی بات کو محض شوخی و تفنن سے ٹال دینا
معترض کو خاموش نہیں کر سکتا۔ اگر کسی نے اعتراض سرقہ و توارد کا قایم کیا تھا، تو یہ محض شاعری تو نہ تھی بلکہ ایک ایسے خیال کا اظہار
تھا جسے وہ صحیح سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے جواب میں غالب نے صرف شاعری سے کام لیا۔ حالانکہ وہ نہایت آسانی سے کہ سکتا تھا کہ
سرقہ و توارد میں بڑا فرق ہے۔ اور جس بات کو تم سرقہ کہتے ہو وہ محض توارد ہے جو شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے اور ہمیشہ پایا جائے گا
کیونکہ جذبات کی دنیا میں بنیادی تاثرات ہمیشہ ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ فرق پیدا ہوتا ہے صرف انداز بیان سے، اب دیکھیے
ان میں اشتراک مستبعد نہیں۔

معلوم ہوتا ہے غالب کے زمانہ میں بھی سرقہ و توارد کا سوال کبھی کبھی سامنے آجاتا تھا اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی کے سلسلہ میں
یہ الزام قایم کیا جاتا تھا، چنانچہ خود اس نے ایک قطعہ میں بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ شعر کہنا "چک یا تسک" تو ہے نہیں کہ جس پر کسی
نام درج ہو، نام و نشان یا مہر ثبت ہو، اس کا چرانا کیا مشکل ہے۔

مضمون شعر قحط بود در زمانہ نا — یعنی بہت ہر کو بفتاد آں اوست

ہو سکتا ہے کہ غالب کو خود بھی شکایت ہو کہ لوگ اس کے مضامین اُڑا لیتے ہیں اور اسی بات کو اس نے طنزیہ انداز میں
ح ظاہر کیا ہو۔

شاعروں کی جماعت ایک طرح کی پیشہ ور جماعت ہے اور پیشہ میں رشک و رقابت ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ پہلے بھی جب
اعر اُبھرتا ہوا نظر آتا تھا تو اس کی تخفیف کے لئے اس پر سرقہ کے الزامات عاید کئے جاتے تھے جو صحیح بھی ہوتے تھے اور غلط
لیکن چوری پکڑنا آسان نہ تھا، اس کی جرأت وہی کر سکتا تھا جس کا مطالعہ بہت وسیع ہو، تمام مشاہیر شعراء کا کلام اسکے
ہو اور وہ ثبوت میں برمحل اسے پیش کر سکتا ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ملا شیدا اور ملا فیروزی کی نوک جھونک کا ایک نہایت
واقعہ ملاحظہ ہو:-

ملا شیدا، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کا شاعر تھا اور بڑا ذہین شاعر تھا، اس کا عروج دیکھ کر اس کے ہم چشموں میں
شک و حسد پیدا ہوا اور انھوں نے طے کیا کہ اسے کسی نہ کسی طرح ذلیل کیا جائے۔ اس کے لئے انھوں نے یہ تدبیر سوچی کہ
یں میں ملا شیدا سے شعر پڑھنے کی خواہش کی جائے اور اس کے ہر شعر کو سرقہ ثابت کرکے اسے رسوا کیا جائے۔ یہ خدمت ملا
ہ سپرد کی گئی کیونکہ وہ قوتِ حافظہ اور وسعتِ مطالعہ میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا، چنانچہ ایک دن یہ محفل منعقد ہوئی اور لوگوں
یدا سے درخواست کی کہ وہ اپنا کلام سنائے۔

اس نے اپنا ایک شعر پڑھا جو آج بھی بہت مشہور ہے:-

حیست میدانی مے گلگوں مصفا جوہرے　　　حسن را پرورد گارے عشق را پیغمبرے

ملا فیروز نے کہا شعر خوب ہے، لیکن رودکی اس سے بہت پہلے کہہ چکا ہے:

عشق را پیمبر و لیکن حسن را آفریدگار توئی

شیدا نے دوسرا شعر پڑھا:

زبسکہ کردہ غمت بند در جگر ناخن　　　چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

(اس میں مچھلی کے فلس کو ناخن سے تشبیہ دی ہے)

ملا فیروز نے کہا یہ مضمون آپ کا نہیں خیاثائے حلوائی کا ہے۔ کہتا ہے:

زبسکہ سینہ کندم و ناخن بر آں نشست　　　چوں پُشت ماہی ست سراپائے سینہ ام

ملا شیدا نے جھنجھلا کر تیسرا شعر پڑھا:-

گر بصحرا موشکافی دشت پر سنبل شود　　　در بدر یا رو بشوئی خار ماہی گل شود،

ملا فیروز نے کہا کہ یہ مضمون تو کاتبی کا ہے:-

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ　　　خار ماہی را رود در قعر دریا پا بہ گل،

اس کے بعد شیدا نے یہ شعر سنایا:

ذات تو بود صحیفۂ کون کہ کرد　　　از روئے ادب مہر خدا بر پُشتت

اور فیروز نے جواب میں ہاتفی کا یہ شعر سنا دیا:-

نبوت را توئی آں نامہ در مُشت　　　کہ از تعظیمت آمد مُہر بر پُشت

پھر شیدا نے ایک شعر اور سنایا:-

زلف او را رشتۂ جاں گفتم و گشتم خجل　　　زانکہ ایں معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

فیروز نے کہا یہ بات آپ سے پہلے ہاتفی کہہ چکا ہے:-

کس نیارد مصرعہ پیچیدۂ زلف گفت　　　لیک ایں مضموں ترا در پیش پا افتادہ است

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی نوک جھونک پہلے بھی ہوتی تھی ــــــــــــــــ اس لئے اگر
غالب کے عہد میں بھی اس طرح کی باہمی چشمک پائی جاتی تھی تو جائے عجب نہیں۔ لیکن غالب نے جس طنزیہ انداز سے ان الزامات کا
جواب دیا ہے وہ اطمینان بخش نہیں ہے۔

اگر غالب کے یہاں توارد پایا جاتا ہے تو یہ کوئی عیب نہ تھا کہ اس سے انکار کیا جاتا، بلکہ شعراء متقدمین کے کلام سے اس کے
جواز کو ثابت کیا جا سکتا تھا، لیکن چونکہ غالب نے اساتذۂ قدیم کے کلام کا مطالعہ بہت کم کیا تھا (اور غالباً اسی نے اس کو
تقلید و تتبع سے باز رکھ کر اس کی انفرادیت علٰحدہ قایم کی) اس لئے وہ ملا فیروز کی طرح کوئی جواب نہ دے سکا اور طنزیہ جواب
دے کر خاموش ہو گیا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا غالب کا مطالعہ محدود تھا اور صرف چند مشہور شعراء (بیدل، عرفی، نظیری، حزیں،
ظہوری وغیرہ) کا کلام اس نے دیکھا تھا اور وہ بھی جستہ جستہ، اس لئے جو نقوش اس کے ذہن میں مرتسم ہوئے وہ بھی محدود
تھے اور اسی لئے اس کے کلام میں ہم کو توارد کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

بیدل کا مطالعہ بے شک اس نے اول اول زیادہ کیا تھا، اور اس کی پیروی بھی اس نے کرنا چاہی جس کو وہ بقول خود
نباہ نہ سکا، اس لئے اس کے کلام میں ہم کو بیدل ضرور چھپا ہوا نظر آتا ہے، کہیں کم کہیں زیادہ، چنانچہ اس کے اُردو دیوان کا بڑا
حصہ مولانا خیرآبادی نے اسی لئے حذف کر دیا کہ وہ بیدل کا ناقص تتبع تھا اور اس کے بعد بھی جو حصہ رہ گیا وہ ناگوار اشکال پسندی
سے یکسر خالی نہ تھا، مثلاً:-

بیدل: در طبیعت فسردہ صفا با کدورت ست　　　آئینہ می کند چہ زنگار آب را

غالب: صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر　　　تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

دونوں شعروں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

بیدل: منزلِ عیش تو وحشت کدۂ امکاں نیست　　　چمن از سایۂ گل پشتِ پلنگ ست اینجا،
در وحشت ایں بزم بعشرت نتواں زیست　　　ہر چند چراغانش گُلِ پشتِ پلنگ است

غالب: نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی　　　ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

مضمون ایک ہے۔ فرق یہ ہے کہ بیدل نے سایۂ گل کو پشتِ پلنگ (چیتا) کہا اور غالب نے داغ زمرد کو۔

بیدل: آنجا جواب نامۂ عاشق تغافل ست　　　بیہودہ انتظار خبر می کشیم ما

غالب: قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

دونوں شعروں کا مفہوم یہی ہے کہ جواب خط کا انتظار بیکار ہے۔ کیونکہ وہ جواب لکھیں ہی گے نہیں۔

: چشم وا کردن کفیل فرصت نظارہ نیست — پرتو این شمع آغوش وداع محفل ست
: تا کجا اے آگہی رنگ تماشا باختن — چشم وا گر دیدہ آغوش وداع جلوہ ہے

چشم وا کو دونوں نے آغوش وداع ظاہر کیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بیدل نے اس کو محفل سے متعلق کیا اور غالب نے جلوہ سے۔

غالب و بیدل میں کہیں کہیں توارد و ہم آہنگی پائے جانے کا سبب صرف یہ ہے کہ اول اول غالب، بیدل سے بہت ... اور بیدل کی بہت سی ترکیبیں غالب کے تحت شعور میں مرتسم ہوگئی تھیں اور بغیر قصد وہ قلم سے نکل جاتی تھیں۔

اسی طرح بعض دوسرے شعراء کے خیال کا توارد بھی غالب کے یہاں پایا جاتا ہے، مثلاً:-

خاقانی کا شعر ہے:

زیں نام چو ترکنم زباں را — صد بوسہ دہد لبم زباں را

غالب نے اس خیال کو اس طرح نظم کیا ہے:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

خاقانی استرآبادی کا شعر ہے:

نامت ز رشک پیش کسے چوں نمی برم — آیا سراغ از کہ کنم منزل ترا

غالب کہتا ہے:

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

... دختر امیر علی جلائر کا ایک بڑا پاکیزہ شعر ہے:

من اگر توبہ ز مے کردہ ام اے سرو سہی — تو خود ایں توبہ نکردی کہ مرا مے ندہی

غالب نے اسی خیال کو اس طرح نظم کیا:

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

خسرو کا شعر ہے:

نہ بے عمر دراز عاشقاں گر — شب ہجراں حساب عمر گیرند

غالب نے بالکل اسی خیال کو اس طرح نظم کیا ہے:

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں — شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

غالب کا بڑا مشہور شعر ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

حالانکہ خسرو بہت پہلے یہ خیال اس طرح ظاہر کر چکا تھا:

اے گل چو آدمی ز زمیں گو چگونہ اند — آں رو بہا کہ در تہ گرد فنا شدند

غالب کا شعر ہے:

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا — بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

عاقل شیرازی کہتا ہے:-

آب و رنگ گلستان عشق اکنوں از من ست — عندلیباں ہر چہ می گویند مضموں از من ست

نظیری کا شعر ہے:

راز دیرینہ ز رخ پردہ بر انداخت دریغ — حال من شہرہ بہ انشاد غزل کرد دریغ

غالب نے اس خیال کو یوں نظم کیا ہے:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

دونوں شعروں کا خیال ایک ہی ہے۔

تلاش سے اور بھی اشعار غالب کے یہاں ایسے مل سکتے ہیں جو دوسرے شعراء کے کلام سے متوارد ہوں، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جو غالب کی دون مرتبت ہو اور وہ معذرت میں "نہاں خانۂ ازل" کی داستان چھیڑ دے۔

غالب کی مثنوی نگاری

(...ز فتحپوری)

...نہ بینش غالب کی پہلی مثنوی سراج الدین بہادر شاہ کی مدح میں ہے، لیکن ہے وہ متصوفانہ جس میں بہ تتبع شعرائے متصوفین حسن و عشق کے پس منظر میں وحدت الوجود اور تہذیب اخلاق کے کچھ دھندلے سے نقوش پیش کئے گئے ہیں

مدح بادشاہ سے بھی کوئی زیادہ تعلق نہیں، انداز بیان تو خیر اس کا وہی ہے جو ...ے، یہاں ہر صنف سخن میں پایا جاتا ہے، لیکن ندرت خیال و شگفتگی فکر کے لحاظ سے چنداں قابل لحاظ نہیں۔

...د و داغ دوسری مثنوی کا نام "درد و داغ" ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ اصل چیز تقدیر ہے۔ لاکھ کوشش کی جائے نوشتۂ قسمت مٹ نہیں سکتا۔ اس نظریہ کو انھوں نے ایک حکایت کے ذریعہ سے ذہن نشین کرنا چاہا ہے اس ...کی غایت تو بلند نہیں، وہی فرسودہ سی بات ہے جسے شعراء متصوفین نے بار بار دہرایا ہے، لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے ...بڑی لطیف و دلکش تعبیرات نظر آتی ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ ایک نہایت خستہ حال خاندان جو "ماں، باپ اور بیٹے" تین افراد پر مشتمل ہے، زندگی کی صعوبتوں سے تنگ ...ل کی طرف نکل جاتا ہے وہاں انھیں ایک درویش مل جاتا ہے جو ان کے حال پر رحم کھا کر خدا سے ان کے حق میں دعا کرتا ہے ...طرف سے جواب ملتا ہے کہ مصیبت و دولت ان کے لئے مقسوم ہو چکی ہے، دعا بیکار ہے، درویش مکرر عرض کرتا ہے اور ...س پر راضی ہو جاتا ہے کہ اچھا ان کی ایک ایک دعا قبول کر لی جائے گی۔ یہ سن کر عورت جو بہت ضعیف ہو چکی تھی، از سر نو اعادۂ ...کی دعا مانگتی ہے اور وہ قبول ہو جاتی ہے، لیکن ٹھیک اسی وقت جب وہ پیکر حسن و جمال بن جاتی ہے، ایک نوجوان شاہزادہ ...وت سے گزرتا ہے اور دونوں ایک دوسرے پر مایل ہو جاتے ہیں۔ شاہزادہ اسے گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس کا ضعیف ...ماجرا دیکھ کر سخت دلگیر ہوتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ "اے خدا، اس بدکار عورت کو تو خنزیر (سؤر) بنا دے"۔ اس کی بھی یہ دعا ...ہو جاتی ہے، اور جب شاہزادہ دفعتاً یہ دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ گھوڑے پر عورت نہیں بلکہ سؤر یا سوار ہے تو وہ اسے زمین ...اپنی راہ لیتا ہے۔ لڑکا جب یہ دیکھتا ہے تو اسے اپنی ماں پر بڑا رحم آتا ہے اور وہ دعا کرتا ہے کہ "خدایا، تو پھر اسے اپنی ...حالت پر واپس لے آ" اور وہ پھر بڑھیا کی بڑھیا رہ جاتی ہے۔ مدعا اس حکایت سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ گو خدا نے ان سب کی ...دل کر لی، لیکن ان کی بدقسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا اور جیسے تھے ویسے ہی رہے۔

حکایت میں قطعی کوئی جدت نہیں، مثنوی رومی میں بھی اکثر جگہ اس قسم کی حکایتیں نظر آتی ہیں، لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے ...ادر سے خالی نہیں۔

مثلاً اس خاندان کی زبوں حالی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:-

دست تہی آئینۂ قسمتش
زخم دل و داغ جگر دولتش

مایۂ او داغ و دہاں در پرش
پیرہنش از جگرش چاک تر

اس کے بعد اس ہولناک صحرا کا نقشہ پیش کیا ہے، جہاں اس خاندان کا گزر ہوا اور سخت صعوبتیں اُٹھائیں:

وادیِ دردے کہ ہزارش بلا
خاک بلا خیز و غبارش بلا

لالۂ خود روش ز خون شہید
ذرہ آتش از جوہر تیغ یزید

گشت دراں وادیِ آشوبناک
جامۂ عریانیِ شاں، چاک چاک

ہر قدم آنجا بسر دار بود
عربدۂ آبلہ و خار بود

آبلہ ساغر شد و ساغر نشد
زہرہ شد آب و لب شاں تر نشد

ناگہاں وہ ایک درویش کے تکیہ تک پہنچ جاتے ہیں اور اپنا قصۂ درد اسے سناتے ہیں:

از تپش آباد جنوں می رسیم
تا بہ کمر در سینہ مجنوں می رسیم

آمدۂ بخت سیاہیم ما
حسرتیِ سعیِ نگاہیم ما

از نفسے فیض مسیحا بیار
مژدۂ اقبال تمنا بیار

درویش ان کا طالع دیکھتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں تاریکی کے سوا کچھ نہیں، پھر بھی وہ خدا سے التجا... کرتا ہے کہ:-

اے تو خداوند جہاں رحم کن
بر من و ایں غمزدگاں رحم کن

اور خدا اجازت دیتا ہے کہ ایک بار وہ جو چاہیں طلب کر لیں۔ یہ خبر سن کر عورت کو پھر اپنا عہد حسن و شباب یاد آجاتا... اور وہ بے اختیار یہ دعا مانگتی ہے کہ:-

پس ز تو خواہم کہ جوانم کنی
رونقِ خوباں جہانم کنی

یوسف اقبال بہ خوابم رساں
اچھو زلیخا بہ شبابم رساں

اس کی یہ دعا قبول ہو جاتی ہے اور اس کا ضعیف شوہر سوچتا ہے کہ اب اسے امیری و تونگری کی دعا مانگنا چاہئے کہ ناگہاں ایک نوجوان شاہزادہ شکار کے تعاقب میں اس طرف آنکلتا ہے اور وہ جنگل میں ایک غیر معمولی حسین عورت کو دیکھ کر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ عورت بھی یہ سوچ کر کہ اگر میرا شوہر تونگر ہو بھی گیا تو کیا، رہے گا ویسا ہی ضعیف و ناچار، شاہزادہ کی طرف مایل ہو گئی اور

پشت ہوسہائے نہاں گرم کرد
جائے در آغوش جواں گرم کرد

در ہوس جلوۂ رنگ حنا
دست بیالود بہ خون وفا

یہ دیکھ کر اس کا ضعیف شوہر از راہ رشک اپنی تونگری کا خیال چھوڑ کر یہ دعا کرتا ہے کہ:

ساز تلافی سلوکش بساز
مسخ کن و مادۂ خوکش بساز

ر اس بددعا کے نتیجے میں وہ :

خوک شد و بدنفسی ساز کرد   با سر و رو عربدہ آغاز کرد

ر شہزادہ نے :

راست ز اسپ بزمین بر فگند   بر سر خنگ از سر زیں بر گشت

کا اپنی ماں کو اس مسخ شدہ صورت میں دیکھ کر بے چین ہوگیا اور اس نے دعا کی خدایا تو پھر اس کو اپنی اصلی حالت پر لے آ۔
ی تھی پھر ویسی ہی ہوگئی۔

روئے چناں موئے سفیدش چناں   واں لب و دنداں و صدائش چناں

غالب کی یہ مثنوی شاعرانہ محاسن، تعبیرات نادرہ، ندرت تشبیہ و کنایہ اور جذبات کی بے اختیاری کے لحاظ سے بڑی
ی دیر عجیب و غریب چیز ہے۔
مثنوی انھوں نے اس وقت لکھی ہے جب وہ دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے بنارس میں چند دنوں کے لئے ٹھہر گئے تھے اور وہاں
ن و جمال نے انھیں از خود رفتہ بنا دیا تھا۔
مثنوی زیادہ طویل نہیں۔ قریب قریب ۱۰۰ اشعار کی ہے، لیکن چند اشعار میں انھوں نے اپنا سارا جمالیاتی ذوق سمیٹ کر
دیا ہے اور اس کوشش میں جس جوش و خروش اور جس گرمی کے ساتھ انھوں نے یہ مثنوی لکھی ہے، اس کا
خود اس طرح کرتے ہیں :-

نفس با صور ہمساز ست امروز   خموشی محشر راز ست امروز
رگ سنگم، شرارے می نویسم   کف خاکم غبارے می نویسم
دل از شور شکایتہا بجوش ست   حباب بے نوا طوفاں خروش ست

(شرار نوشتن، غبار نوشتن اور طوفاں خروش بیدلانہ ترکیب ہے)

شکایت گونہ دارم از احباب   کتان خویش می شویم بہ مہتاب

وسرا مصرع بالکل بیدل کا ہے)

در آتش، از نوائے ساز خویشم   کباب شعلۂ آواز خویشم

ی کے بعد وہ اپنے دہلی سے باہر نکلنے کا ذکر کرتے ہیں کہ:

محیط افگندہ بیروں گوہرم را   چو گرد افشاندہ آہن جوہرم را
کس از اہل وطن غمخوار من نیست   مرا در دہر پنداری وطن نیست

کا لطیفہ مشہور ہے کہ جب اس نے یہ مصرعہ نظم کیا —— "خوک شد و بچہ زدن ساز کرد" —— تو اس پر اعتراض ہوا کہ خوک (سور کے
ا، بلکہ تم پا گھر ہوتا ہے۔ غالب نے یہ سنکر کہا کہ : میں نے کبھی سور پالا، میرے باپ دادا نے، مجھے کیا خبر کہ سور کے بچہ ہوتا ہے یا کچھ اور
بچہ زدن کو بدنفسی سے بدل دیا۔

پھر اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اگر دلی چھٹ گئی تو کیا غم کیونکہ اب میں ایسی جگہ ہوں کہ :-

کرمی آید بہ دعوئے گاہ لافش   جہان آباد از بہر طوافش

(یعنی خود دلی جس کے طواف کے لئے بیتاب ہے)
اس کے بعد وہ بنارس کا ذکر شروع کرتے ہیں :-

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور   بہشت خرم و فردوس معمور
تناسخ مشرباں چوں لب کشایند   بکیش خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد   دگر پیوند جسمانی نگیرد
چمن سرمایۂ امید گردد   بہ مردن زندۂ جاوید گردد

(یعنی باوجودیکہ تناسخ ہندوؤں کا خاص عقیدہ ہے، لیکن کاشی کے متعلق ان کا یہ خیال ہے کہ جو شخص یہاں مرجاتا ہے
پھر کوئی اور جسم اختیار نہیں کرتا، گویا یہاں مرجانا زندۂ جاوید ہوجانا ہے)

یہاں کی فضا اور آب و ہوا کے متعلق فرماتے ہیں :

شگفتے نیست از آب و ہوائش   کہ تنہا جاں شود اندر فضائش
ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا   ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا

(تعجب کی بات نہیں اگر یہاں روح و جان کے سوا کچھ نہیں کیونکہ یہاں کی فضا ہی ایسی ہے اور آب و خاک کی زند
سے اس کو کوئی تعلق نہیں)
اسی خیال کی تکرار وہ اس سے زیادہ نادر و لطیف انداز میں یوں کرتے ہیں کہ :-

نہاد شاں چو بوئے گل گراں نیست   ہمہ جاں اند جسمے درمیاں نیست

(یہاں کی زندگی تو بالکل بوئے گل کی طرح سبک و لطیف ہے، یہاں تک کہ اگر ہم یہ کہیں کہ یہاں کا انسان جان
ہے اور جسم سے اس کا کوئی تعلق نہیں، تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔)
اس کے بعد ان کی فکر شاعرانہ کچھ اور آگے بڑھتی ہے، یہاں تک کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ :

بتسلیم ہوائے آں چمن زار   ز موج گل، بہاراں بستہ زنار

موج گل کو زنار کہنے کا خیال صرف بتکدۂ بنارس ہی میں پیدا ہو سکتا تھا جس کے متعلق وہ آخر کار کھل کر کہہ اٹھتے ہیں کہ

سوادش پائے تخت بت پرستاں   سراپایش زیارتگاہ مستاں
عبادتخانۂ ناقوسیان ست   ہمانا کعبۂ ہندوستان ست

اس کے بعد وہ پری وشان کاشی کے ذکر پر آجاتے ہیں اور اپنی پوری شاعرانہ قوت صرف کردیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور   سراپا نور ایزد، چشم بد دور
میانہا نازک و دلہا توانا   ز نادانی بکار خویش دانا

...یعنی بتان کاشی کی تعمیر شعلۂ طور سے ہوئی ہے اور سراپا نور ہی نور ہیں)

ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار — خرامے صد قیامت فتنہ، دربار

...یک گلستاں جلوہ — صد قیامت فتنہ، تعریف ہیولیٰ ہے)

زانگیز قد، انداز خرامے — بپائے گلبنے گسترده دامے

...ان کی خوش قامتی و خوش خرامی کا انداز! — یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پھول والے درخت کے پائیں جال بچھا ہوا ہے)

زرنگیں جلوہا، غارتگر ہوش — بہار بستر و نور دز آغوش

...دوسرے مصرع میں جنسی ہیجان کو جس حُسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کی داد صرف لذت خاموش ہی سے ہو سکتی ہے)

زتاب جلوۂ خویش آتش افروز — بتان بُت پرست و برہمن سوز

...دوسرے مصرع کے زور کو دیکھئے)

قیامت قامتاں، مژگاں درازاں — ز مژگاں برصف دل تیزہ بازاں

بہ تن، سرمایۂ افزایش دل — سراپا مژدۂ آسایش دل

...س سے زیادہ لطیف تعبیر ان کے جسم کی لطافت و نعومت، لوچ اور نرمی ملاحظہ ہو:

ز مستی موج را فرمودہ آرام — ز نغزے آب را بخشیدہ آرام

...گویا پانی ایک موج ہے جو ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہے)

...س کے بعد وہ بتان کاشی سے ہٹ کر یہاں کی سرزمین و فضا کا ذکر کرتے ہیں کہ:

بیاباں در بیاباں لالہ زارش — گلستاں در گلستاں نوبہارش

...ہر وہ ایک مرد روشن ضمیر سے پوچھتے ہیں کہ اس زمانہ میں جب اخلاق مہر و وفا مفقود ہو چکے ہیں اور باپ بیٹے بھی ایک دوسرے ...ت نہیں، قیامت کیوں نہیں آجاتی، اور وہ کونسا وقت ہوگا جب صور قیامت پھونکا جائے گا، تو وہ سرزمین کاشی ... اشارہ کر کے کہتا ہے کہ:

کہ حقا نیست صانع را گوارا — کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنا را

...خدا یہ نہیں چاہتا کہ قیامت آئے اور یہ رنگین شہر برباد ہو جائے)۔

...ب کی تمام مثنویوں میں یہی ایک مثنوی ایسی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان پر بھی اک زمانہ ادادۂ شباب کا آیا تھا اور اس قدر ... کہ وہ اس کے اظہار سے باز نہ رہ سکے۔

...ب و غالب کی اس مثنوی میں کوئی نمایاں خصوصیت نہیں ہے سوا اس کے کہ جہاں جہاں اس نے کرداروں کی تصویر پیش کی ہے وہاں بیشک اس کی انفرادیت نمایاں ہے۔ مقصد کے لحاظ سے بالکل متصوفانہ چیز ہے جس میں ثابت ... دنیا میں جاہ و دولت، قوت و جبروت بے اعتبار چیزیں ہیں، اصل چیز وہ روحانی ریاضت و ہمت ہے جو انسان کو

شہود حق کی منزل تک لے جاتی ہے۔

اس مقصد کے اظہار کے لئے غالب نے ایک تمثیلی کردار کسی بادشاہ کا پیش کیا ہے، جو بڑا سخی و فراخ دست تھا:

بادۂ سرمستی دل را خُمے — از نم تردستی خود قلزمے

ایک بار اس نے عام اعلان کر دیا کہ جو شخص اپنی حاجت لے کر آئے گا وہ پوری کی جائے گی۔ اس صلائے عام کو سن کر جوق در جوق اس کے حضور میں پہونچ گئے جن میں ایک درویش بھی تھا:

از تب و تاب پُر دل خویش اخگرے — زیر لحافے کف خاکسترے

ہیچ گہ از جنت نیاسودۂ — چہرہ بہ گرد سفر آلودۂ

سر بسر آئینۂ عرض شکست — گجنہ گلیمے و کدوئے بدست

اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں کوئی گدا نہیں ہوں کہ خیرات و دینار طلب کروں، بلکہ

باتو فروشندۂ کالاستم

اپنا مال بیچنے آیا ہوں۔

بادشاہ نے کافی روپیہ دے کر اس کا کدو اور گلیم لے لیا اور رخصت کر دیا۔

رات کو جب وہ سو گیا تو پردۂ خواب پر ایک نہایت جمیل عورت اس شان سے نمودار ہوئی کہ:

رائتے از نور برافراشتہ — پردۂ رنگے بہ گل انباشتہ

در نظر از شوخی اعضائے او — بود چمن خیز سراپائے او

پرچم نور ہاتھ میں لئے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی، اور حسن و جمال کا یہ عالم کہ اس کا سراپا گویا چمن ہی چمن تھا۔

بادشاہ نے اس سے پوچھا تو کون ہے اور کیوں آئی ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں تیری دولت ہوں، تیرا جاہ و جلال ہوں ...

گفت کہ من دولت و مال توام — آئینۂ جاہ و جلال توام

لیکن اب تو نے ایک درویش سے اس کے گلیم کا سودا کر لیا ہے اور میرا تیرے پاس کیا کام۔

بوئے گلیمے بدماغم زدی — سیلی صرصر بچراغم زدی

بادشاہ نے یہ سن کر ہنسی خوشی اسے رخصت کر دیا، لیکن اس کے بعد ہی خواب میں ایک دوسری صورت سامنے آئی ... نہایت تنومند، قوی ہیکل:

زند قوی پنجہ خصم افگنے — جم سرو برگے و تہمتن تنے

بادشاہ نے پوچھا تو کون ہے تو اس نے کہا کہ میں تیری قوت و جبروت ہوں۔ جب تک دولت تیری رفیق رہی میں بھی تیرا ساتھی رہا لیکن اب "دلق و کدو" سے میرا کیا میل!

بادشاہ نے یہ سُن کر اسے بھی رخصت کر دیا اور اس کے بعد ایک تیسری صورت اور نظر آئی۔

جلوہ گرے آفت نظارۂ — برق زنقشال وے انگارۂ

رنگ گل آئینۂ دیدار او — موج پرے جوہر رفتار او

جلوۂ جنت ز غبارش سرِ نے   چشمۂ کوثر، ز محیطش نمے

یعنی جنت نام ہے اس غبار کا جو دمِ رفتار اس کی خاکِ پا سے بلند ہوا اور چشمۂ کوثر عبارت ہے اس کے دریائے ہستی کے
[ا]یک نم سے۔

بادشاہ نے پوچھا تو کون ہے:-

گفت من آئینۂ نازِ توام   ہمت آفاق گدازِ توام

بادشاہ نے اس سے کہا کہ مجھے تیری ہی ضرورت تھی۔ تیرا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں گا۔

دامنت از کف نگزارم دگر

کیونکہ تو میری تاریک راتوں کی شمع اور میرے خاکستانِ ہستی کی بہار ہے:

شمع و چراغِ شبِ تارم توئی   خاکم و سامانِ بہارم توئی

[ا]س نے: بوسہ بدستِ شہِ آزادہ زد

[ا]ور بولی: دولت و اقبال غلام تو باد   تاب و تواں بادۂ جامِ تو باد

[ک]یونکہ انسانی کامیابی کا راز صرف ہمتِ مردانہ ہے۔ ظاہری جاہ و دولت کوئی چیز نہیں۔

در دل از آزادِ دل اندیشہ کن   گنج برافشاں و کرم پیشہ کن

[ا]س کے بعد غالب خود اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ بتا وہ تیرے سازکی وہ اثر آفرینی کہاں گئی اور وہ تیرا نغمہ کہاں ہے
[...] پانی کر دیتا تھا:

آں اثرِ پردۂ سازت چہ شد   زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد

[...] بھی ہوس جاہ میں مبتلا ہو گیا اور اپنے آپ کو کنوئیں میں ڈھکیل دیا:

در ہوسِ جاہ فرو رفتہ ای   حیف کہ در چاہ فرو رفتہ ای

[...]ک وقت تھا جب تو

چشمِ پریشاں نظرے داشتے   جلوہ بہ ہر رہگزرے داشتے

[او]ر اب یہ حال ہے کہ:

ہر چہ کنوں می نگرم در نظر   شاہد و شہرت و شراب و شکر

[...]ری آدھی رات تو تو نے سو کر گزار دی اور باقی نصف صرف چاندنی کی پیمائش میں:

نیمہ شب از عمرِ تو در خواب رفت   نیمہ بہ پیمودنِ مہتاب رفت

[...] بھی ہوش میں آ، اور اوہام کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف آ:

پیروی وہم مکن زینہار   سر ز گریبانِ حقیقت برآر

[...]ھر ملتا ہے وہ خود اپنی ہمت سے ملتا ہے:

آنکہ درین پردہ سگالی بود   از اثرِ ہمتِ عالی بود

مگر کس قسم کی ہمت؟ وہ نہیں جو مادی علایق سے متعلق ہے بلکہ وہ جو

بادہ زخمخانۂ لا می دہد

اور نفی ماسوا کی طرف لے جاتی ہے۔

بادِ مخالف پانچویں مثنوی ہے جو ہنگامۂ کلکتہ سے متعلق، جہاں فارسی کے اچھے اچھے جاننے والے موجود تھے۔ جب غالب یہاں پہونچے اور ان کا کلام لوگوں نے سنا تو بعض اہل فن نے کچھ اعتراض کئے اور اپنی سند میں کلامِ قتیل پیش کیا۔ غالب جو ہندوستان کے فارسی شعراء میں صرف خسروؔ کو مانتا تھا اور فیضیؔ کا بھی زیادہ قائل نہ تھا (بقول خود) "فرید آباد کے ایک کھتری" کا نام سن کر بہت برہم ہوا۔ اس پر ہنگامہ زیادہ بڑھا اور اس کے کلام پر ہر طرف سے اعتراض کی بوچھار ہونے لگی۔

میرزا نے جو طبعاً ہنگاموں سے گھبراتے تھے اور جس کام کے لئے آئے تھے اس کی کاربرآری میں اس نزاع کو سنگِ راہ سمجھتے تھے اس لئے تنگ آکر یہ مثنوی لکھی جس میں انھوں نے اپنی غریب الوطنی اور اہل کلکتہ کی نامہربانی کا ذکر کرتے ہوئے اعتراضات کا جواب بھی نہایت نرمی سے دیا۔

یہ مثنوی بیانِ حسن و عشق اور ذکرِ تصوف سے خالی ہے، لیکن چونکہ ان کی ذات سے تعلق رکھتی ہے، اس لئے اس میں شاعری کم لیکن صداقت جذبات بہت زیادہ ہے اور اس لحاظ سے یہ نظم بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں سب سے پہلے انھوں نے اکابرِ کلکتہ کی تعریف کی ہے کہ:

اے تماشائے بزمِ سخن   اے مسیحا دمانِ نادرہ فن
ہر یکے صدرِ بزمِ یار گے   شمعِ خلوت سرائے کار گے
اے سخن را طرازِ جاں دادہ   صفو را سازِ گلستاں دادہ
اے گرامی نشانِ ریختہ گو   نغز در پاکشانِ عربدہ جو

اس شعر میں ان کو ریختہ گو کہکر گویا ایک طنز بھی کر دیا ہے کہ "تمھیں فارسی سے کیا واسطہ" اس کے بعد ان کے جذبات رحم و شرافت سے اپیل کی ہے کہ:-

اسد اللہ بخت برگشتہ   در جسم و ہیچ مجز برگشتہ
گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست   بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست
آرمیدن و چید روزے چار   خستہ را بہ سایۂ دیوار

پھر وہ اپنی داستانِ غم بیان کرتے ہیں جو اس مثنوی کی جان ہے۔ کہتے ہیں:

کیستم؟ دل شکستۂ غم زدۂ   بیدلے، خستۂ، ستم زدۂ
دردمندے جگر گدا ختۂ   از غمِ دہر زہرہ باختۂ
چہ بلا ہا کشیدہ ام آخر   کہ بہ اینجا رسیدہ ام آخر
پسیہ روز غربتم مبینید   تیرہ شبہائے محنتم مبینید

بر غریباں کار و است ستم　　رحم اگر نیست خود چرا ست ستم

یعنی اگر تم ایسے ستم زدہ شخص پر رحم نہیں کرسکتے، تو ظلم بھی نہ کرو۔

اس کے بعد پھر ان کا جذبۂ خودداری عود کر آتا ہے اور کہتے ہیں کہ جو تم میرے مقابلہ میں قتیل کا ذکر کرتے ہو سو خدا کے لئے
ان کرو کہ وہ شخص جو طالب، عرفی و نظیری کا ماننے والا ہے وہ

چہ شناسد قتیل و واقف را

تی مثنوی

اس کا کوئی خاص عنوان غالب نے تجویز نہیں کیا بلکہ اس کا موضوع ایک طویل عبارت سے یوں ظاہر کیا ہے:۔

"خودداری شان نبوت و ولایت کہ در حقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت؟"

یہ مثنوی یکسر اعتقادی چیز ہے اس لئے اس میں محاسن شعری کی جستجو کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں تصوف کا وہی
جسے صوفیہ وحدت الوجود، وحدت الشہود، لا وجود الا اللہ، وغیرہ کی مختلف اصطلاحات سے ظاہر کرتے ہیں، غالب نے بھی
مثنوی میں بیان کیا ہے۔

یہ اصطلاحات ذہنی مفروضات کی حیثیت رکھتی ہیں جو اسلام میں صوفیۂ عجم کے وساطت سے داخل ہوئیں اور جب مسلمانوں
کی زندگی کے اختتام کے ساتھ حکومتوں میں زوال آیا تو بہت سی خوش باش جماعتوں نے اپنا اثر قائم کرنے کے لئے یہ نیا فلسفہ ایجاد
کیا جو صحیح تعلیمات اسلامی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، اور یونان و ہند و فلسفہ سے مستعار ہے۔

یہاں اس مسئلہ پر کسی بسیط گفتگو کا موقع نہیں، لیکن مختصراً یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح باور کرلیا جائے تو
ی افادیت اخلاقی نقطۂ نظر سے ضرور مسلم ہے اور وہ یہ کہ جماعتی و مذہبی تفریق سے بلند وہ جامعۃ البشریت کی تشکیل کا ذریعہ
تا ہے، لیکن چونکہ اس کا تعلق صرف نظریہ سے ہے عمل سے نہیں، اس لئے یہ اعتقاد رضائے الٰہی اور تقدیر الٰہی کو ایک چیز
دیتا ہے اور انسان کو ہر حال میں راضی بہ مشیت الٰہی رہنے کی تعلیم دیتا ہے اور انسان اپنی ذاتی انفرادیت کھو بیٹھتا ہے
اس نظریہ کی تبلیغ کرنے والوں میں مولانا رومی کو خاص اہمیت حاصل ہے، جنھوں نے بہت سی حکایات وضع کر کے اس
کو زیادہ دلنشین بنایا اور بعد کو تمام وہ مرموزات (Symbols.) جو انھوں نے اپنی مثنوی میں اختیار کئے
ری میں رواج پاگئے۔

پھر لطف یہ ہے کہ وحدت وجود کا خیال صرف مناظر و مظاہر طبیعی ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ انسانی تمدن و معاشرہ تک
اور اسے پہونچنا چاہئے تھا کیونکہ جب ایک صوفی کو حجر و شجر، باغ و راغ، بہار و خزاں میں بھی ہر جگہ خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے
وجہ نہیں کہ انسان کو وہ اس سے محروم سمجھے اور چونکہ انسانوں میں سب سے بڑے انسان ہونے کا فخر رسول اللہؐ کو حاصل ہے
سب سے پہلے انھیں کے اسم مبارک احمد کا میم اڑا کر انھیں "ذات احدی" کے مرتبہ تک پہونچا دیا۔

غالب نے اس مثنوی میں بھی بالکل یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ:

میم امکاں اندر احمد منزوی ست　　چوں ز امکاں بگزری دانی کہ چیست

اس کے بعد اس رنگ میں اولیا کو پیش کیا گیا اور غالب نے بھی اس کا اظہار اس طرح کیا کہ:۔

نور حق ست احمد و لمعان نور　　از نبی در اولیا دارد ظہور

یہاں تک کہ براہ راست خدا سے بھی طلب خیر کا سوال باقی نہ رہا بلکہ بات یہاں تک پہونچ گئی کہ:

چوں اعانت خواہی از یزدان پاک　　یا معین الدین اگر گوئی چہ باک

اس سلسلہ میں وہ موئے مبارک و رقدم رسول کی بھی مادی سطح تک پہونچ جاتا ہے اور ان کی پرستش جزو ایمان قرار دیتا ہے

دلنشین با بود ناں روئے موئے　　وہ کہ گردانند کے زاں موئے روئے

ہر کہ اول ہست دایاں نیز ہم　　چوں فرو زد عشق با نقش قدم

اس سلسلہ میں غالب نے مسئلۂ امتناع نظیر پر بھی گفتگو کی ہے۔ یعنی یہ کہ رسول اللہ کا نظیر و مثیل پیدا ہونا ممکن ہو یا نہیں
کہا جاتا ہے کہ غالب نے مولانا فضل حق خیرآبادی کے ارشاد کی تعمیل میں یہ مثنوی اسی غرض سے لکھی تھی کہ وہ امتناع نظیر
کو ثابت کریں، لیکن وہ اپنی رو میں یہ لکھ گئے کہ:

ایں کہ می گوئی توانا کردگار　　چوں محمد دیگرے آرد بکار

با خداوند دو گیتی آفریں　　ممتنع نبود ظہورے ایں چنیں

یعنی خدا کے لئے دوسرا محمد پیدا کرنا ممتنع نہیں:

آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید　　میتواند مہر دیگر آفرید

یعنی جس طرح خدا نے ایک سورج پیدا کیا ہے، اسی طرح دوسرا سورج بھی پیدا کرسکتا ہے۔

جب مولانا خیرآبادی نے اس مثنوی کو پڑھا تو وہ بہت برہم ہوئے اور غالب سے کہا کہ یہ تم نے کیا بک دیا ہے۔
چنانچہ بعد کو انھوں نے چند اشعار اضافہ کر کے مولانا خیرآبادی کے ارشاد کی تعمیل کردی۔ بعض اشعار یہ ہیں:۔

لیک در یک عالم از روئے یقیں　　خود نمی گنجد دو ختم المرسلیں

جوہر کل بر نتابد تشنیہ　　در محمد رہ نیابد تشنیہ

ہر کرا با سایہ نپسندد خدا　　ہمچو اوئی نقش کے بندد خدا

یعنی کائنات میں صرف ایک ہی ختم المرسلین ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کو محمد کا سایہ تک
پسند نہ تھا (کہا جاتا ہے کہ آپ کے جسم کا سایہ نہ پڑتا تھا) تو وہ اس کا مثل کیونکر پسند کرسکتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے کیوں اول اول امتناع نظیر کی تردید کی اور بعد کو پھر اسے تسلیم کرلیا۔ بغیر تسلیم کرنے کی
وجہ تو ظاہر ہے کہ مولانا خیرآبادی کی فرمائش تھی اور وہ اسے رد نہ کرسکتے تھے، لیکن امتناع نظیر کی تردید ان کا اصل خیال تھا جو بے اختیار
ان کے قلم سے نکل گیا اور اس کا خاص سبب تھا۔

غالب مذہباً شیعی تھے اور حضرت علی کے ساتھ ان کی عقیدت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو مسلم کہنے کی جگہ "اسد اللّٰہی"
کہنا زیادہ پسند کرتے تھے ــ (ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم) ــ اور ایک قصیدہ میں اس نعرہ تک پہونچ گئے کہ:۔

فیض دم "انا اسد اللّٰہ" برآوردم　　منصور لا ابالی بے دار و بے رسن

اور صاف صاف کہہ دیا کہ:۔

اے از تو بودہ رونقِ دینِ محمدی — رویت سہیل و کعبہ ادیم و عرب یمن

[ال]غرض وہ تولائے علی میں اس قدر سرشار تھے کہ محمدؐ اور علیؑ میں فرق و امتیاز ان کے لئے دشوار تھا اور باوجود مولانا خیرآبادی
ں کے رسول اللہؐ کا امتناعِ نظیر تسلیم کرنے میں انھیں تامل تھا، کیونکہ وہ حضرت علیؑ کو بھی محمدؐ کا نظیر ہی سمجھتے تھے بلکہ میں تو
ہوں کہ اگر ان سے علیؑ کے امتناعِ نظیر کے بارے میں کچھ لکھنے کو کہا جاتا تو وہ پہلے ہی بلا تامل لکھ دیتے اور مولانا خیرآبادی کو دوبارہ
[ض]رورت نہ ہوتی۔

[غ]الب کی یہ مثنوی یوں تو اپنے مطالب کے لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، لیکن نظر بریں کہ غالب کے اخلاق پر خاص
تی ہے یقیناً اہم ہے۔

[ج]یسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں کہ غالب غالی شیعہ تھے، کیونکہ وہ حضرت علیؑ کو وصی نبی اور امام اول مانتے تھے:

شاہِ نجف، وصی نبی، مرتضیٰ علی — آں از ائمہ اول و ثانی ز پنجتن

[ا]ور گو وہ تبرائی شیعی نہ ہوں، لیکن یہ کیونکر ممکن ہے کہ علیؑ کو وصی رسول اور امام اول ماننے کے بعد وہ پہلے تین خلفاء سے خوش
ں گے، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف تو ان کے غلو کا یہ عالم ہے کہ وہ صرف حضرت علی ہی کو منتہائے انسانیت
تے ہیں اور دوسری طرف یہ رنگ کہ (جیسا کہ اس مثنوی سے ظاہر ہے) یا علی کے ساتھ یا معین الدین (اجمیری) کہنا
ں گوارا ہے۔ پھر اگر اس کا سبب محض "رعایتِ خاطرِ احباب" تھا، تو اس میں کلام نہیں کہ غالب بڑے وسیع اخلاق کا
[تھ]ا اور اگر یہ سب کچھ غالب نے اس وقت کے سنی ماحول اور مولانا خیرآبادی کے ڈر سے ایسا لکھا تو پھر ان کو سچا شیعہ
نے میں بھی ہم کو تامل کرنا چاہئے، بشرطیکہ اس سلسلہ میں تقیہ کی سپر سے کام نہ لیا جائے۔

...یں اور آٹھویں مثنوی

یہ دونوں مثنویاں تہنیت "عید شوال" سے متعلق ہیں۔ پہلی مثنوی میں بہادر شاہ ظفر کی تہنیت ہے اور دوسری میں ولیعہد کی۔ دونوں مثنویاں بہت مختصر ہیں۔

[س]اتویں مثنوی کے ابتدائی چند اشعار کو چھوڑ کر جن میں غالب نے اپنا ذکر کیا ہے، باقی تمام اشعار ہلکے ہیں اور ان میں جوشِ شعر
ے کوئی شعر ایسا نہیں جو عرفی کے اس شعر کا جواب ہو سکے:

صباحِ عید کہ در تکیہ گاہِ ناز و نعیم — گدا کلاہِ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

[ا]سبب ظاہر ہے کیونکہ عرفی دربار جہانگیر کا شاعر تھا جب بذل و نوال عام تھا اور ہر شخص اپنی جگہ مسرور و خوشحال تھا،
اس کے غالب بزم تیموری کی آخری بجھتی ہوئی شمع کا دیکھنے والا تھا، جب خود بادشاہ مصائب میں مبتلا تھا۔ اس لئے
تہنیت بالکل رسمی سی بات ہے اور اس میں حقیقت کی کوئی دلکشی نہیں پائی جاتی، بلکہ ہنسی آتی ہے یہ دیکھ کر جس فرمانروا
دہلی کی چار دیواری کے اندر منحصر ہو، اس کے متعلق یہ کہنا کہ:

رزمش اگر بانگ بر اشہب زند — قافلۂ خور بدلِ شب زند
حفظش اگر عام کند ایمنی — شمع نپرد ز ہوا روشنی

ک بات ہے۔

[ا]س آغاز مثنوی میں خود اپنی شاعری کے متعلق غالب کا یہ کہنا:-

از اثر ناطقہ بندم طراز
غازہ نہم بر رخِ خورشید و ماہ
ساختہ ام خامہ ز بالِ پری

البتہ نادرست نہیں — یہی رنگ آٹھویں مثنوی کا ہے جو ولیعہد کی تہنیت سے متعلق ہے۔

نویں مثنوی

ایک منظوم تقریظ ہے شاہ اودھ کے دیباچۂ نثر "بست و ہفت افسر" پر، جس میں غالب نے کافی شاعرانہ مبالغہ
کے ساتھ اس کی تعریف کی ہے اور اس کے دو تاریخی نام — "نیر اعظم" اور "ریاض ملک معنی" بھی تجویز کئے
ہیں۔ اول تو یہ مثنوی اتنی مختصر نظم ہے کہ اسے مثنوی کہنا بھی زیادتی ہے، لیکن اگر اصطلاحاً اسے "صنف مثنوی" سے علیحدہ نہیں کیا
جا سکتا، تو مثنوی نگاری کی ضروری شرائط سے یقیناً معرا ہے۔

دسویں مثنوی

یہ مثنوی بھی منظوم تقریظ ہے سر سید احمد خاں کے تصحیح کئے ہوئے نسخۂ 'آئین اکبری' کی اور چونکہ یہ کارنامہ کسی
بادشاہ یا امیر کا نہ تھا بلکہ سید احمد خاں کا تھا اس لئے غالب نے اس میں بڑی آزادی سے کام لیا ہے اور
صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ زمانہ داستانِ پارینہ دہرانے کا نہیں اور اگر ہم مان لیں کہ آئین اکبری بڑا اچھا آئین تھا تو بھی اس کا
ذکر اب بے معنی ہے، اس زمانہ میں انگریزی حکومت اور اس کی ترقیوں کو دیکھنا چاہئے، چنانچہ کہتا ہے:-

صاحبانِ انگلستاں را نگر — شیوہ و اندازِ اینان را نگر
تا چہ آئین ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

اور اس سلسلہ میں مغربی ایجادات کا ذکر کرتے ہوئے دخانی جہاز، برقی روشنی، گراموفون وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے
اور پھر سر سید کو مشورہ دیا ہے کہ لندن جاؤ اور دیکھو کہ وہاں کا کیا رنگ ہے:-

رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ — شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
کاروبارِ مردمِ ہشیار بیں — در ہر آئیں صد نو آئیں کار بیں

اس زمانہ میں آئین اکبری کا ذکر کرنا گویا مردہ پروری ہے اور

مردہ پرور دن مبارک کار نیست — خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

حیرت ہے کہ وہی غالب جو اس سے قبل اپنی بعض مثنویوں میں کافی "مردہ پروری" کا ثبوت دے چکا ہے، اس وقت
اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب انگریزوں کو خوش کرنا ہو جن سے اسے کاربرآری کی امید تھی یا پھر
یہ کہ واقعی اس کے احساس میں کوئی خاص تغیر پیدا ہو گیا ہو۔

[مثنوی] ابر گہر بار   مرزا کی آخری مثنوی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ واقعی حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے، یہ مثنوی باوجود ناتمام ہونے کے کم و بیش ۲۵۰ اشعار پر مشتمل ہے اور مرزا کا بڑا زبردست شاہکار ہے۔

یوں تو غالب کے فکر و بیان کی وہ انفرادی خصوصیت جو ہر صنف سخن میں اس کے یہاں نمایاں ہے اس کی بعض دوسری ... میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرزا کے لب و لہجہ، میرزا کے انداز فکر اور اس کے جوش بیان کا جو دلکش امتزاج "ابر گہر بار" میں نظر آتا ہے، اس کی دوسری مثال ادب فارسی میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

یہ مثنوی نہ صرف غالب کی شاعری بلکہ اس کی طبعی و جذباتی میلانات کی بھی بہترین نمایندہ ہے جسے وہ اپنی زبان میں "... وہ انداز آشکارا بہ من" — کہتا ہے — اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک سبب ہے۔

غالب یوں چاہے رند بادہ خوار رہا ہو یا کچھ اور لیکن اپنے عقاید کے لحاظ سے وہ یقیناً غالی شیعی تھا، وہ جہاں کہیں [علی] کا ذکر کرتا ہے، بالکل بے قابو ہو جاتا ہے اور وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے جو انتہائے عشق و ولا کے عالم میں بے اختیارانہ ... [از] کہا جا سکتا ہے۔

مثلاً پانچویں قصیدہ میں وہ حضرت علی کو اس طرح پیش کرتا ہے :-

شاہِ نجف، وصی نبی، مرتضیٰ علی، — آں از ائمہ اول، و ثانی زپنجتن،
ذاتش دلیل قاطع ختم نبوت است — وقت غروب مہر، زند ماہ بے سخن،
بالیدہ از تو علم و عمل در پناہ دیں — اے آبروئے خلوت و سطر انجمن۔

اور پھر انتہائی جوش میں آکر اپنے متعلق کہتا ہے :-

فیض دم "انا اسد اللہ" برآورم — منصور لا اُبالی بے دار و بے رسن

[چھ]ٹے قصیدہ میں وہ جناب امیر کو صف انبیاء سے بھی اونچے لے جاتا ہے :-

ہم شوکتِ آثار علی بود کہ داؤد — صد چشم برہ داشت زاجزائے زرہ وا
ہم مژدۂ دیدار علی بود کہ می بخت — در پردۂ احیا ز لب و کام مسیحا

[یع]نی داؤد کی زرہ بھی آثار علی ہی کا کرشمہ تھی اور عیسیٰ کے لب جاں بخش کی جنبش بھی مژدۂ دیدار علی کا صدقہ تھا۔

[ا]سی سلسلہ میں وہ یوسف اور موسیٰ کا بھی ذکر کرتا ہے لیکن اس طرح :-

ہم موجۂ رفتار تو ذوق رخ یوسف — ہم جادۂ راہ تو رنگ خواب زلیخا،
در گرد خرام تو نگہ ریشۂ طوبیٰ — در بزم تماشائے تو مژگاں ید بیضا

[سا]تواں قصیدہ بھی منقبت کا ہے اور اس میں ایک جگہ وہ خدا اور علی کے درمیان پردۂ امتیاز کو بھی چاک کر دیتا ہے :-

یارب زیا علی نہ شناسم قلندرم — یک مے ز آبگینہ و ساغر برآورم
در دل بہ جستجو ہمہ ایزد در آورم — وز لب بہ گفتگو ہمہ حیدر برآورم

[ایک] قصیدہ میں وہ حضرت علی کو :- نفس نبی، خدائے نصیری، امام خلق
[کہہ کر] ... یاد کرتا ہے۔

غالب نے نعت اور منقبت کے جتنے قصاید لکھے ہیں، ان میں جوش تو لا تو ضرور ہے لیکن تغزل بہت کم، حالانکہ عرفی کی طرح غالب کے بعض مدحیہ قصاید میں بہت سے اشعار متغزلانہ رنگ کے بھی پائے جاتے ہیں۔

جس مثنوی (ابر گہر بار) کا ذکر اس وقت مقصود ہے، وہ بھی جناب امیر کی منقبت سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا رنگ قصاید سے مختلف ہے اور ہونا چاہئے کیونکہ اول تو مثنوی بجائے خود بیانیہ شاعری کی خاص صنف ہے اور تجزیۂ جذبات کی کافی وسعت اپنے اندر رکھتی ہے، دوسرے یہ کہ یہ مثنوی شاید غالب نے اسوقت لکھی تھی جب وہ "شکایت کہ گنجد بہ دل زبہاری" — کی منزل سے گزر رہے تھے اور اس شدید عقیدت و محبت کی وجہ سے جو انھیں حضرت علی کی ذات سے تھی، اس مثنوی میں انھوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ایک انسان بر بنائے اعتماد و خلوص اپنے محبوب سے کہہ سکتا ہے۔

اس مثنوی کے کئی حصے ہیں جن میں حمد، نعت، منقبت، ساقی نامہ، مغنی نامہ اور معراج نامہ کے علاوہ ایک مناجات بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں اور غالباً اسی مقصود کے پیش نظر انھوں نے یہ مثنوی لکھی تھی۔

اس مثنوی کا آغاز سپاس نامہ سے ہوتا ہے جس میں تفصیل کے ساتھ مبداء فیاض کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ہے جو اس کا مظہر نہیں، اس کی شاہد نہیں :-

ز ہر پردہ پیدا نوا ساز نے — بہر جلوہ پنہاں نظر باز نے
بہ کشور کشایاں دم گیر و دار — بہ مسکیں گدایاں غم پود و تار
بہ مے در فروغے کہ چوں بردمد — ز سیمائے میخوارہ منیز دمد
بہ نے در نوائے کہ چوں برکشند — بہ آواز آں ناو ساغر کشند
بہ آزادہ دستے کہ ساغر زند — بہ افتادہ سنگے کہ بر سر زند

اس کے بعد اس نے مختلف پہلوؤں سے خدا اور کائنات کے تعلق کو ظاہر کیا ہے کہ دنیا میں ہر شخص خواہ کسی مذہب و مسلک کا پیرو ہو، اس کا مقصود صرف اسی ایک ذات خداوندی کی پرستش ہے جس کے جلوؤں سے دنیا معمور ہے۔

بہ ہر لب کہ جوئی نوائے از وست — بہ ہر سر کہ بینی ہوائے از وست

یہاں تک کہ جو صنم پرست ہے اس نے بھی :-

بہ بت سجدہ زاں رو روا داشتہ — کہ بت را خداوند پنداشتہ

اور جو آتش پرست ہیں وہ بھی :-

بہ آتش نشان خدائی دہند

الغرض :-

نظرگاہ جمع پریشاں یکے ست — پرستندہ انبوہ و یزداں یکے ست

اس سپاس نامہ کے بعد جو انتہائی جوش و خروش سے نظم کیا گیا ہے، وہ مناجات شروع کرتا ہے اور اس سلسلہ میں وہ کہتے کہتے اس منزل تک آتا ہے جب ان سپاسگزاریوں کے بعد وہ حرف شکایت زبان پر لاتا ہے اور یہ حصہ نہ صرف یہ کہ اس

...ی جان ہے، بلکہ غالب کا وہ شاہکار ہے جس کی نظیر فارسی زبان میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔
... وہ سب سے پہلے قیامت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں غالب نے اس مناجات میں اپنا دل چیر کر سامنے رکھ دیا
...طنز و شوخ نگاری کا جو انداز اس نظم میں اس نے اختیار کیا ہے وہ اس لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا کہ اس میں نہایت
...احساس غم بھی شامل ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ اپنی زندگی کے تلخ حقایق کو اس سے بہتر اسلوب میں پیش کر سکتا تھا۔
...اور شاعرانہ محاسن دونوں حیثیتوں سے غالب کی یہ مثنوی قدر اول کی حیثیت رکھتی ہے اور جمالیاتی احساس کے نقطۂ نظر
...راغ دیر" اپنی جگہ بڑی قابل قدر چیز ہے۔

مثنوی "ابر گہربار" میں ان کے مناجات کا وہ حصہ جہاں خدا سے انھوں نے گفتگو کی ہے، غالب کا شاہکار ہے۔
...قیامت قایم ہے۔ نفسی نفسی کا عالم ہے، کوئی کسی کا پرسان حال نہیں، میزان عدل قایم ہے لوگوں کے اعمال وزن کئے جا رہے
...سی کی نیکی کا پلہ بھاری ہے اور کسی غریب کی بدیاں نیکیوں پر غالب ہیں، اسی ہنگامۂ گیر و دار میں غالب بھی شامل ہیں،
...کبریائی سے حکم ہوتا ہے کہ اس بندے کے بھی اعمال تولو، مرزا سنتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ میرے نامۂ اعمال میں بدی کے سوا
...ہے، وہ آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "بار خدایا مجھے کچھ عرض کرنا ہے" اور وہ یہ کہ اے میرے مولا، میں تیرا حد درجہ
...اعت نالایق بندہ ہوں اور سخت گنہگار، اس لئے میرے اعمال کے تولنے کی زحمت نہ فرما، میرے داغ اور ہرے ہو جائیں گے
...یہ ہے کہ تو میرے رنج و غم کو تول لے کہ میرا سرمایۂ عمر تو سوا رنج و غم کے اور کچھ تھا ہی نہیں جو تیرا ہی عطیہ تھا، اس لئے اب
...دوزخ میں ڈالنے اور عذاب دینے کی فکر کیوں؟ اور اگر عذاب ہی دینا منظور ہے، تو پھر اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ
...بے حساب کتاب ہو گیا اور مجھے دوزخ میں بھیجئے، لیکن اگر میرا حساب کتاب ہونا ضروری ہے تو پھر مجھے بھی کچھ کہنے کی
...دیجئے، معاف کیجئے، میں بہت عاجز ہو چکا ہوں اور جب آپ بغیر کہے ہی سب کچھ جانتے ہیں تو پھر میں کیوں نہ کہوں۔
...یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں کافر نہیں ہوں، آتش پرست نہیں ہوں، سوچ کہ میں نے کبھی نہیں پوجا، نہ کسی کو مارا،
...ڈاکہ ڈالا، البتہ اس سے انکار نہیں کہ میں نے شراب پی اور بہت زیادہ پی۔ لیکن اس طرح کہ خود مجھے اس بات پر شرم آتی ہے،
...اگر شراب ہی کا حساب و کتاب کرنا ہے تو جمشید، بہرام، پرویز وغیرہ سے حساب کیجئے، میں کیا اور میری مے نوشی کیا،
...بھیک مانگ کر پی، نہ کوئی باغ، نہ کوئی معشوق، نہ مطرب نہ ساز! یہ بھی کوئی مے نوشی تھی۔
...میں نے زندگی تو گزار ہی دی مگر اب کیا کہوں کہ کس مصیبت سے گزاری ہے، سالہا سال بے مئے گزار دئے اور اس
...حسرت و یاس میں کہ جب ساون بھادوں کی گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی تھیں تو میرا جام شراب سے خالی ہوتا تھا۔ دنیا بھر سبزۂ
...کی بہار سے مست و سرشار رہتی تھی اور میں گھر کا دروازہ بند کئے خاموش پڑا رہتا تھا۔ زمانہ بھر میں پھول کھلے ہوتے تھے
...رنگ میں مست رہتی تھی اور میں غمزدہ اپنے حجرہ میں بند۔ اگر اتفاقاً کبھی شراب ملی تو پیالہ نہ ملا یا پیالہ ملا تو شراب

...ہمسایوں نے میرے ساتھ بدسلوکیاں کیں، تیمارداروں نے مجھے فریب دئے، بے مایہ اور کم حیثیت لوگوں سے مجھے معلوم

کرنا پڑا۔ عمر بھر جیتا رہا، نہ میرے زمانہ میں کوئی ایسا بادشاہ ہوا کہ ظہوری کی طرح مجھے انعام دیتا اور میں اس کو فقیروں اور مسکینوں کو تقسیم کر دیتا۔ نہ تو نے مجھے کوئی معشوق دیا کہ میں اس کے ناز اٹھاتا اور خوش ہوتا۔

اب کیا کہوں کیا کیا مصیبتیں میں نے اٹھائی ہیں اور کیا کیا آفتیں مجھ پر پڑی ہیں، سچ تو یہ ہے کہ جب مجھے وہ باتیں یاد آتی ہیں تو بہشت بھی مجھے ہیچ نظر آتی ہے، پھر تو ہی انصاف کر کہ جو شخص بہشت کو بھی کچھ نہ سمجھے اُسے دوزخ میں بھیجنا کہاں تک جائز ہے۔

اور فرض کیجئے آپ نے مجھے جنت بخش دی تو بھی اس سے کیا ہوتا ہے، جنت میں وہ باتیں کہاں، اگر وہاں صبوحی کے طور پر شراب طہور مل گئی بھی تو جام بلوریں اور زہرۂ صبح کا منظر کہاں۔

معشوق کے بدلے حور ہے۔ مگر نہ اس سے غم ہجر کا لطف آ سکتا ہے نہ ذوق وصل پورا ہو سکتا ہے، وہ جو ہم پہلے بوسہ کے بدلے ہزاروں احسان لاد دیتے تھے، وہ جن کے وصل کے انتظار میں برسوں ہم کو گزارنا پڑتے تھے۔ وہ جو ہم میں اور ہمارے معشوق میں کشاکش ہوتی تھی، ہم کھینچتے تھے اور وہ بھاگتا تھا، وہ جو ہم کو جھوٹی قسمیں کھا کر فریب دیا تھا، یہ تمام باتیں اس تنگ بخت حور میں کہاں، یہاں تو یہ حالت ہے جو بات کہی مان لی، جو حکم دیا بجا لائی، یہ بھی کوئی حسن کا انداز ہے۔ جنت نام کی جنت ہے۔ یہاں نظر بازی کا موقع کہاں، نہ یہاں دیوار میں کوئی روزن کہ جھانک جھانک کر ظالم نہ کوئی دلالہ کہ پیغام سلام لے جائے۔

یہی ساری باتیں تھیں جن کو ہمیشہ دل چاہتا تھا اور کبھی پوری نہ ہو سکی تھیں، اس لئے اگر تو میرے گناہوں کا حساب کرے گا تو میں بھی ہر گناہ کے مقابلہ میں ایک حسرت پیش کروں گا، اور جب گناہوں سے زیادہ میری حسرتیں ہوں گی تو پھر تو ہی بتا کہ حساب کی کیا صورت ہوگی۔

اب انھیں باتوں کو غالب کی زبان سے سنئے:

بروشش ترازو منہ بار من   نسنجیدہ بگزار کردار من
اگر دیگراں را بود گفت و کرد   مرا مایۂ عمر رنج است و درد

مرا خیر یارائے گفتار دہ   چو گویم براں گفتہ زنہار دہ

دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود   چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم   پرستندۂ خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ ابر ہمنی   نبردم کسے مایہ در رہزنی
مگر مے کہ آتش بگورم ازوست   بہنگامہ پروانہ سوزم ازوست
حساب مے و رامش و رنگ و بوے   زجمشید و پرویز و بہرام جوے

که از باده تا چهره افروختند — دل دشمن و چشم بد سوختند
نه از من که از تاب مے گاه گاه — بدریوزه رخ کرده با چشم سیاه
نه بستان‌سرائے نه میخانۂ — نه دستان‌سرائے نه جانانۂ
نه رقص پری پیکران بر بساط — نه غوغائے رامشگران در رباط
شبانگه پے رهزنم شدے — سحرگه طلبگار خونم شدے
تمنائے معشوقۂ باده نوش — تقاضائے بیہودۂ میفروش

چه گویم چو هنگام گفتن گذشت — ز عمر گرانمایه بر من گذشت
بسا روزگاران جدا دادگی — بسا نوبهاران به بے بادگی
بسا روز باران و شبہائے ماه — که بودست بے مے بچشم سیاه
افقہا پر از ابر بہمن مہی — سفالینه جام من از مے تہی
بہاران و من در غم برگ و ساز — در خانه از بے نوائی فراز
جہاں از گل و لاله پر بوئے و رنگ — من و حجرۂ و دامنے زیر سنگ
اگر تافتم رشته گوہر شکست — وگر یافتم باده ساغر شکست
چه خواهی ز ذوق دل آلوده من — ببین جسم خمیازه فرسوده من

نه بخشنده شاہے که بارم دہد — بہر بار زر بیل بارم دہد
نه نازک نگارے که نازش کشم — بہر بوسه زلف درازش کشم

ہنوزم همان دل به جوش اندر است — ز دل بانگ خونم به گوش اندر است
چو آن نامرادی بیاد آیدم — بفردوس هم دل نیاسایدم
دلے را که گرم شکیبد بباغ — در آتش چه سوزی به سوزنده داغ
صبوحی خورم گر شراب طہور — کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شہر و بہائے مستانه کو — ہنگامه غوغائے مستانه کو
در آن پاک میخانۂ بے خروش — چه گنجائی شورش نائے و نوش
سیه مستی ابر و باران کجا — خزان چون نباشد بہاران کجا

اگر حور در دل خیالش که چه — غم ہجر و ذوق وصالش که چه

چه منت نهد نا شناسا نگار — چه لذت دهد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسه اینش کجا — فریبد به سوگند دینش کجا
نظربازی و ذوق دیدار کو — بفردوس روزن به دیوار کو
نه چشم آرزومند دلالۂ — نه دل تشنۂ ماه پرکالۂ

از انہا که پیوسته میخواست دل — ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل

بہر جرم گر زو دے دفتر رسد — ز من حسرتے در برابر رسد

بفرمائے کیں داوری چوں بود — که از جرم من حسرت افزوں بود

غالب کا معیارِ سخن

(اقتباسات از دیوان غالب نسخۂ عرشی)

[اتباع] اساتذہ

میرزا صاحب اساتذۂ زبان کے پیرو تھے، گو اُردو کے بارے میں اُنھوں نے اپنے متعلق کہا ہے کہ: "اس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں" لیکن نواب علی بہادر، والی باندہ کو یہی مشورہ دیا ہے کہ "از ریختہ گویان گفتار میرزا... در نظر داشتہ باشند"۔

فارسی میں خود بھی اہل زبان سے استناد کرتے ہیں اور شاگردوں کو بھی اسی کی ہدایت فرماتے ہیں کہ: "لغت فارسی اور روزمرہ... ہو، تو اہل زبان کے کلام سے سند کریں" اور اس امر میں اپنے معاصرین سے استفادے کو بھی موجب عار نہیں جانتے۔

سرور کو لکھا ہے:-

"حضرت کو یہ معلوم رہے کہ میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا، اُس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔

جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جمہور کو، اُن کا حال کیا گزارش کروں۔ ایک اُن میں صاحب "برہان قاطع" ہے۔

میرزا تفتہ کو تحریر کرتے ہیں:-

"اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے، جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو، تو ہم اُس کو مانیں، ہندیوں کو کیوں مسلم الثبوت جانیں؟"

مجروح کو لکھا ہے:-

"فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی۔ آپ جب تک کلام اہل زبان میں نہ دیکھیں، اُس کو جائز نہ جانئے گا۔ مگر کلام سعدی و نظامی و حزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے، نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا۔"

... نثر پنج آہنگ: ۲۲۲ ——— خطوط: ۱/ ۱۸۳ ——— مکاتیب اُردو: ۲۵۹، لاہور ایڈیشن خطوط: ۱/ ۱۰۰ ———
... ۱۳۳

ایک اور خط میں پھر سرور کو لکھا ہے:-

"ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمہ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ میاں فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے۔ کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔ حشمت اور مکین اور واقف اور قتیل، یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجئے۔ کلام میں ان کے مزا کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟

فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اس میں پیروی قیاس روائے عام ہے۔ واقف سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے، اور ہر اعتراض بجا ہے، بایں ہمہ، وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منھ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنایع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی۔ اور شیوۂ روش کو خوب برت گئے۔ فارسی وہ کیا جانیں۔ قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے۔ شاعری سے اُن کو کیا علاقہ!"

راہِ سخن کے غول

ہندی شاعروں اور ادیبوں کا نام میرزا صاحب نے راہِ سخن کے غول رکھا تھا۔ خلیفہ شاہ محمد، مادھوراو... غنیمت اور قتیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نواب انورالدولہ بہادر شفق کو لکھا ہے:

"یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کو کیا جانیں، ہاں طبع موزوں رکھتے تھے، شعر کہہ لیتے تھے:-

ہرزہ مشتاب و پے جادہ شناسان بردار
اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت"

اصل الاصول

ان کی رائے میں فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول، مناسبت طبیعت اور تتبع کلام اہل زبان... سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبع کلام اہل زبان۔ لیکن نہ اشعار قتیل و واقف۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیفا دیکھا جائے، اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے، اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ جائے، تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے"

نواب علی بہادر کو اصلاح اشعار کے سلسلے میں از راہ نصیحت لکھا ہے:-

"اگر پیروی این راہ، و محرمی پردۂ این ساز آرزو دارند، از ریختہ گویان گفتار میر و میرزا، و از زمزمہ پارسی گویان، کلام صائب و عرفی و نظیری و حزیں در نظر داشتہ باشند، نہ در نظرہ قتیل [illegible] سواد ورق از دیدہ [illegible] بلکہ به کوشش [illegible] تا سروجہ گشتہ"

تتبع لہجہ

اسی طرح وہ اس کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ اہل ایران کے لہجہ کا اتباع کیا جائے کہ یہ ایک خلقی وصف، اور اس کے تاثر... تتبع ہے۔ چنانچہ قدر بلگرامی کو لکھا ہے:-

عود: ۱۳۳ — اُردوئے معلیٰ: ۲۵۹ — خطوط ایضاً: ۸ — کلیات نثر پنج آہنگ: ۲۲۲ — ایضاً ۱/ ۱۸۹

"تحریریں اساتذہ کا تتبع کرو: مغل کے لہجہ کا۔ لہجہ کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے، نہ دبیروں اور شاعروں کا
ایسے تتبع کو میرا سلام۔"

شعر گوئی

میرزا صاحب نے ابتدائی سن تمیز ہی سے شعر گوئی شروع کر دی تھی، مگر اس وقت کیا عمر تھی اس بارے میں خود اُن کے بیان میں اختلاف ہے۔ کلیات فارسی کے خاتمہ میں تحریر فرماتے ہیں[۲]:

"از روزی کہ شمارۂ سنین عمر از آحاد فرا ترک رفت، و رشتۂ حساب زحمت یازدہمین گرہ بخود برگرفت، اندیشہ در دوام کام فراخ برداشت، و کریوہ و مغاک بادیۂ سخن پیمودن آغاز نہاد۔"

…سلطان غلام محمد بہادر کو لکھتے ہیں[۳]:

"در دہ سالگی آثار موزونی طبع گرفت۔"

…قدر بلگرامی کو ۱۸۶۵ء میں تحریر کیا ہے[۴]:

"بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی پچاس برس اسی شیوے کی ورزش میں گزرے۔"

…شاکر کو بھی یہی تخمینہ تحریر فرماتے ہیں[۵]:

"۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔"

…ان بیانوں کے پیش نظر میرزا صاحب کی سخن سرائی کا آغاز ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء)، ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) اور ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) … سی ایک سال ہوا تھا۔ ان میں سے راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً دس برس کی عمر سے شعر گو تھے، کیونکہ کلیات فارسی کا … سب سے قدیم ہے، یہی ثابت کرتا ہے، اور اس کی تائید اُن کے بھوبی لال کنہیا لال کے بیان سے بھی ہوتی ہے جسے خواجہ حالی مرحوم … کیا ہے۔

…گوئی: پہلا دور

میرزا صاحب کی شاعری کا آغاز ریختے سے ہوا تھا۔ گلِ رعنا کے دیباچے میں فرماتے ہیں[۶]:

"در آغاز فکر … بہ حرف نگارش اشعار اُردو زبان بود۔"

…تاریخ کو لکھتے ہیں[۷]:

"خاکسار نے ابتدائی سن تمیز میں اُردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔"

…سال کی عمر تک زیادہ تر اُردو ہی میں لکھتے رہے۔ بعد ازاں فارسی زبان سے فطری لگاؤ کی بنا پر فارسی میں کہنے لگے ——

…تحریر کیا ہے[۸]:

"۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔"

…شمس الامراء کو فرماتے ہیں[۹]:

…۵۵۳ – ۲ کلیات نثر پنج آہنگ: ۱۰۹ – ۳ عود: … – ۴ … – ۵ عود: ۱۵۵ – ۶ یادگار غالب … – ۷ … – ۸ عود: ۱۵۹ – ۹ کلیات نثر پنج آہنگ: ۲۰۸

"تا پارسی زبان ذوق سخن یافت، ازاں وادی عنان اندیشہ برتافت .... کہ بیش بیسی سال ست،
کہ اندیشہ پارسی سگال ست۔"

یہ خط اپریل ۱۸۴۹ء سے پہلے لکھا گیا تھا —— "کتاب خانۂ رام پور میں "پنج آہنگ" کا ایک مطبوعہ نسخہ محفوظ ہے جو مذکورہ بالا تاریخ کو دہلی کے مطبع دار السلام سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن میں یہ خط شامل ہے اور اس میں غالب نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ گزشتہ ۲۰ سال سے فارسی میں فکر سخن کرتے ہیں۔ اگر ہم اسے ۱۸۴۹ء کا تسلیم کر کے مجموعہ میں سے ۲۰ سال وضع کر دیں تو ریختہ گوئی کے خاتمہ اور پارسی سگالی کے آغاز کا سال ۱۸۲۹ء قرار پائے گا۔ اور چونکہ وہ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے، اس لئے اس وقت اُن کی عمر ۳۲ سال کی ہوگی، جو شاکر کے نام کے خط میں ذکر کی جا چکی ہے۔

ریختہ گوئی: دوسرا دور

۲۵ سال کی عمر کے بعد میرزا صاحب فارسی زبان کی نظم و نثر کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ اس زمانہ میں ریختہ کہنے کا بھی اتفاق ہوا، لیکن فارسی کے مقابلہ میں اُس کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہے اسی لئے انھوں نے اس پوری مدت میں اپنے آپ کو "فارسی نگار" کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

۱۸۵۰ء میں قلعہ سے تعلق پیدا ہوا، تو شاہ ظفر کی بدولت اُن کی ریختہ گوئی نے دوبارہ جنم لیا اور شاہی مشاعروں کے لئے مختلف طرحوں میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

غدر کے بعد دلی پر آلام و مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بادشاہ جلا وطن کئے گئے اور اُن کے ہوا خواہ شہر بشہر مارے مارے پھرنے لگے۔ میرزا صاحب کا دل ٹوٹ گیا اور وہ شعر و شاعری کو خیرباد کہہ کر زندگی کے دن پورے کرنے لگے۔

تاہم اس زمانہ میں بھی صاحبانِ کرم کے خیال سے کچھ کہنا پڑتا تھا، لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت تھوڑی ہے، اس لئے انھیں پچھلے دور کا تتمہ خیال کرنا چاہیے۔

فارسی نگاری

اگرچہ میرزا صاحب نے ابتدائی سن تمیز میں اُردو زبان میں سخن سرائی کی، لیکن وہ آغاز ہی سے نظم و نثر فارسی کے عاشق تھے۔ اس لئے اُن کا ابتدائی اُردو کلام، تخیل اور الفاظ دونوں میں فارسی کہلانے کا زیادہ مستحق ہے۔

بقول خود وہ پچیس سال کی عمر تک بیدل، شوکت اور اسیر کی طرز پر ریختہ لکھتے رہے۔ تمیز آنے پر طبیعت نے اس خارزار سے باہر نکلنے کی تدبیر سجھائی، اور انھوں نے نظیری، عرفی وغیرہ خداوندانِ سخن کے کلام کا مطالعہ کر کے، اُن کی راہ پر گام زنی شروع کی۔

تعریفِ سخن

میرزا صاحب سخن کی تعریف میں فرماتے ہیں[۱]: "سخن ..... گراں ارز متاعِ عالمِ قدس است" اس متاعِ قدس کو قدرت نے کیا کچھ اوصاف عطا کئے ہیں، اس کے متعلق دیباچہ دیوان فارسی میں لکھتے ہیں[۲]:

"سخن را در خیرگی نہاد و پاکیزگی گوہر و برشتگی مضمون و گدازشِ نفس، و حیاشی سپاس و رنگِ شکوہ، و شناسائی نغمہ و دود شیون، و روائی کار، و رسائی بار، و پردہ کشائی راز، و جلوہ فروشی نوید و سازگاری آئین و دلارائی نگارش، و ہمواری صلا، و درشتی دورباش، و گزارش وعدہ، و سپارش پیام، و دیباچۂ بزم و چکامۂ رزم حاصل۔"

---

۱ کلیات نثر پنج آہنگ: ۲۰۷ – ۲ کلیات فارسی: ۸

لیکن محفلِ ادب میں جس "سخن" کو بار حاصل ہے، وہ "ایک معشوقۂ پری پیکر ہے، تقطیعِ شعر اُس کا لباس اور مضامین اُس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہدِ سخن کو اس لباس اور اس زیور میں روکشِ ماہِ تمام پایا ہے۔"

…س شاہد کی تعریف، اس کے مدارجِ حُسن اور اختلافِ روش و طرزِ سخن گوئی اور اُس کے داخلی و خارجی اوصاف کی تاثیر … فرماتے ہیں:

"گفتارِ موزوں کہ آں را شعر نامند، در ہر دل جائے دگیر، و در ہر دیدہ رنگی دگیر، و سخن سرایاں را ہر ز خرخشی دگیر، و ہر ساز آہنگی دگیر دارد۔"

…ں "گفتارِ موزوں" کے الفاظ میں قدرے ابہام تھا، جس سے سیکڑوں دماغ گمراہ ہو گئے تھے، اس لئے مزید صراحت …: "شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔"

…ب شعر

میرزا صاحب کے حسبِ ذیل بیانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے نزدیک شعر کے لئے کیا اوصاف درکار ہیں:

ایک قصیدہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"ہزار آفریں کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے! واہ، واہ! چشمِ بد دور! تسلسلِ معانی سلاستِ الفاظ۔"

…کے قصیدہ کے متعلق فرماتے ہیں:

"انشاء اللہ خاں کا بھی قصیدہ میں نے دیکھا ہے۔ تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے اور اچھا سماں باندھا ہے۔ زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دلنشین۔"

…ی کی ایک فارسی غزل کے متعلق تحریر کیا ہے:

"کیا پاکیزہ زبان ہے، اور کیا طرزِ بیان!"

…ی غزل کی داد دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"دم بھر ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے۔ "ابداع" اس کو کہتے ہیں "جدتِ طرز" اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ و نیا، اہلِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لائے ہو۔"

…غزل کے ایک شعر کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سحر ہوئی، خبر ہوگی، اس زمین میں وہ شعر یعنی:

تمھارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر
جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں تو ڈرتا ہوں نظر ہوگی

کتنا خوب ہے، اور اُردو کا کیا اچھا اسلوب ہے!"

…نج آہنگ: ۳۳۳ — ۵ خطوط: ۱/ ۸۳ — ۶ خطوط: ۱/ ۹۱ — ۷ اُردوئے معلّٰی: ۲۶۵، خطوط: ۱/ ۲۹۸ —
…معلّٰی: ۳۱۳، عود: ۴۴، خطوط: ۱/ ۱۳۲ — ۹ اُردوئے معلّٰی: ۲۶۹، خطوط: ۱/ ۲۹۸ — ۱۰ اُردوئے معلّٰی:
…، خطوط: ۱/ ۳۰۹ —

قہر کی مثنوی کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مثنوی پہنچی، جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں، کیا خوب بول چال ہے! انداز اچھا، بیان اچھا، روزمرہ صاف، بندشوں کا استحکام، کیا کہنا کیا مزہ دے رہا ہے!"

تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دو دو لخت شعر کہنے کا، اس میں طرزِ نشستِ معنی بھی ملحوظ رکھا کرو۔"

اپنی ایک غزل کے متعلق نساخ لکھنوی کو تحریر کیا ہے:

"غزلی کہ اندریں روز با بتازگی در روشِ تازہ گفتہ ام، بعد عذرخواہی تقصیر کہ تعلی برحاشیۂ مکتوب می نگارم۔"

امیر اللہ سرور کو حیدر علی فصیح کی غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

"روشِ پسندیدہ و طرزِ برگزیدہ دارد، وہمیں است شیوۂ مکرمی شیخ امام بخش ناسخ و خواجہ حیدر علی آتش و دگر تازہ خیالاں لکھنؤ۔"

سرور کے ایک شعر کی ان الفاظ میں داد دیتے ہیں:-

"رجب علی بیگ نے جو "فسانۂ عجائب" لکھا ہے، آغاز داستان کا شعر مجھ کو بہت مزہ دیتا ہے:-

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ، یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعِ ثانی کتنا گرم ہے، اور "یاد رکھنا" فسانے کے واسطے کتنا مناسب۔"

نواب باندہ کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"زہی لطفِ طبع، و حدتِ ذہن، و سلامتِ فکر، و حسنِ بیان، ہرگاہ در آغاز چنیں بودہ اند، بشرطِ دوام ورزش و التزامِ مشق، مقام در اندک مایہ مدت علمِ یکتائی خواہند افراشت۔"

جنون بریلوی کو تحریر کیا ہے:

"عربی میں تعقیدِ لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں، فارسی میں تعقیدِ معنوی عیب اور تعقیدِ لفظی جائز ہے، بلکہ فصیح اور ملیح، ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔"

ناسخ مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں:

"مولانا ناسخ کہ در سخن طرحِ نوی ریختہ بوداست، و در ریختہ نقشِ بدیع انگیختہ۔"

انھیں کے بارے میں یہ بھی کہا ہے:

"سبحان اللہ! سخن بروزگارِ مخدوم بپایۂ بلند رسیدہ و اُردو را رونقِ دیگر پدید آمد۔"

---

۱ اُردوئے معلّٰی: ۲۵۰، عود: ۱۱۶، خطوط: ۱/ ۲۹۶ — ۲ خطوط: ۱/ ۱۸ — ۳ کلیاتِ نثر، پنج آہنگ: ۱۱۳ —
۴ ایضاً: ۱۲۵ — ۵ اُردوئے معلّٰی: ۱۰۵، خطوط: ۱/ ۳۶ — ۶ کلیاتِ نثر، پنج آہنگ: ۲۳۲ — ۷ خطوط: ۱/ ۱۴۲ —
۸ کلیاتِ نثر، پنج آہنگ: ۸۲ — ۹ ایضاً: ۱۱۳۔

...نساخ کو لکھا ہے[1]:

"شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔"

خود اپنے کلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے[2]:

"میرا فارسی دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں۔"

لیکن میرزا صاحب کے نزدیک جملوں کو مقدر چھوڑنے کے لئے ضروری ہے کہ سننے والے کا ذہن حذف شدہ الفاظ کی طرف جا سکے، ورنہ وہ اس کو عیب شمار کرتے تھے۔ میر مہدی مجروح کو لکھا ہے[3]:

"می خواہم از خدا و نمی خواہم از خدا
دیدن حبیب را و ندیدن رقیب را

لف و نشر مرتب ہے۔ "می خواہم از خدا دیدن حبیب را، نمی خواہم از خدا دیدن رقیب را۔" خوار و زار و خستہ و سوگوار"

نساخ کے دیوان پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے[4]:

"یہ در دریغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں۔ دیوان فیض عنوان اسم با مسمّی ہے۔ 'دفترِ بے مثال' اس کا نام بجا ہے۔
الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند۔"

...ب شعر

محاسن شعر کے ساتھ عیوب شعر پر میرزا صاحب کا نقطۂ نگاہ دریافت کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ جیسا کہ کسی جگہ ذکر کیا گیا ہے، وہ ابتداً بیدل کی پیروی میں کوشش کرکے ایسا خیال نظم کرتے تھے، جو عام دماغوں کی دسترس ...رہو۔ لیکن آخر میں اس سے خود بھی احتراز کرنے لگے تھے اور شاگردوں کو بھی اس سعی نامشکور سے باز رکھتے تھے ——— ...دہلوی کو لکھتے ہیں[5]:

"قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن، یعنی لطف زیادہ نہیں۔"

اسی طرح میرزا صاحب کو یہ بھی ناپسند تھا کہ مطلع میں تخلص باندھا جائے۔ قدر کو لکھتے ہیں[6]:

"مطلع میں نام اپنا لکھنا رسم نہیں ہے۔ میر کا تخلص دو صورت رکھتا ہے۔ میر جی اور میر صاحب کر کے وہ اپنے کو لکھ جاتا ہے۔ اور کو اس بدعت کا تتبع نہ چاہیے۔"

دیوان کی پہلی غزل کے مطلع میں حروف والفاظ کی قید بھی قابل نہ تھے۔ قدر ہی کو لکھا ہے[7]:

"آغاز دیوان کے شعر یعنی مطلع میں ہرگز حروف والفاظ کی قید نہیں ہے۔ ہاں، ردیف الف کی ہے، امر قابل پرسش کے نہیں، بدیہی ہے۔ دیکھو اور سمجھو۔ یہ جو دیوان مشہور ہیں، حافظ و صائب و سلیم و کلیم، ان کے آغاز کی غزل کے

...اردوئے معلی: ۲۰۳، عود: ۱۵۵ [2] خطوط ۱: ۲۵ [3] ایضاً ۱: ۲۶۹ [4] اردوئے معلی: ۲۰۳، عود: ۱۲۵
...خطوط ۱: ۱۲۵ [6] ایضاً ۱: ۱۹۳ [7] ایضاً ۱: ۱۹۳

مطلع دیکھو اور حروف والفاظ کا مقابلہ کرو، کبھی ایک صورت ایک ترکیب، ایک زمین، ایک بحر نہ پاؤ گے۔ یہ جائے اتحاد حروف والفاظ، لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔"

توارد کے متعلق میرزا صاحب کی یہ رائے تھی کہ اگر پس رو شاعر اپنے پیشرو سے مضمون آفرینی یا طرزِ ادا میں زیادہ لطف ... پیدا کر دے، تو یہ اس کے لئے قابلِ فخریات ہے۔ میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں[1]:

"ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا، وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے:

چاک گردیدم و از جیب بداماں رفتم

پہلا مصرع تمہارا، اگر اس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا، تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔"

میرزا صاحب کو خواہ مخواہ قیود کا التزام بھی ناپسند تھا۔ تفتہ نے شاید اپنے قصاید کو حروفِ تہجی پر مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا... انھیں لکھتے ہیں[2]:

"خبردار، قصاید بقید حروفِ تہجی نہ جمع کرنا۔"

غالب کچھ محقق انگریزی الفاظ نیز اُن مصطلحات کو جو سرکاری دفاتر کی پیداوار تھے یا انگریزی تہذیب و تمدن کی بدولت مروج ہو... تھے، ٹکسال باہر جانتے تھے، اور اپنے روزمرہ میں اُن کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ میرزا صاحب نے اس کے متعلق ۱۸۵۸ء... میں قدر بلگرامی کو لکھا ہے[3]:

"'چاپی' لغت انگریزی ہے۔ اس زمانہ میں اس اسم کا شعر میں لانا جائز ہے، بلکہ مزا دیتا ہے۔ تار بجلی اور دخانی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دئے ہیں، اور دوں نے بھی باندھے ہیں۔ روبکاری اور طلبی اور فوجداری اور سررشتہ داری، خود یہ الفاظ میں نے باندھے ہیں۔"

لیکن عام طور پر میرزا صاحب انتخاب الفاظ میں بہت محتاط تھے۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی کو ۱۸۶۴ء میں ہدایت کی ہے ... کانچوں کی اردو سے بچئے۔ فرماتے ہیں[4]:

"گھات ہیں مدارآری کی — ہم نے غیروں کی غمگساری کی

تقدیم و تاخیر مصرعتین کرکے رہنے دو، اس میں کوئی سقم نہیں۔ 'مدارآری' کانچوں کا لفظ ہے۔ میں اس طرح کے الفاظ سے احتراز کرتا ہوں، مگر چونکہ من حیث المعنی یہ لفظ صحیح ہے، مضائقہ نہیں۔"

قصیدے کے آخر میں ایسے الفاظ جو خاتمہ پر دلالت کرتے ہوں، نہ لانے کو بھی میرزا صاحب عیب جانتے تھے۔ ایطا بھی اُن کے نزدیک عیب تھا۔ چنانچہ ایک مکتوب میں تفتہ کو یوں ذکر لکھا ہے[5]:

"حضرت، اس غزل میں 'پروانہ' و 'پیمانہ' و 'بتخانہ' تین قافیے اصلی ہیں۔ 'دیوانہ' چونکہ علم قرار پاکر ایک لغت جداگانہ متشخص ہو گیا ہے، اس کو بھی قافیۂ اصلی سمجھ لیجئے۔ باقی 'غلامانہ' و 'مستانہ' و 'مردانہ' و 'ترکانہ' وغیرہ

[1] خطوط ۱: ۷۵ — [2] خطوط ۱: ۷۹ — [3] خطوط ۱: ۱۸۹ — [4] ایضاً ۱: ۱۳۵ — [5] ایضاً ۱: ۹۸

مومن خاں:
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا / جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیش تر یہ جوہر نظر آتے ہیں۔ مگر مجھے اُن کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔

اس طرزِ گفتار کا نام میرزا صاحب نے "شیوا بیانی" رکھا تھا، اور شیوا بیان شاعر کے لئے ان چار اوصاف کو لازم قرار دیا تھا۔[1]

"حسنِ عشق و عشقِ سخن، کلامِ حسن و حسنِ کلام۔"

سہل ممتنع

اگر مذکورۂ بالا اوصاف کو ایک جامع و مانع لفظ سے ادا کرنا چاہیں، تو کہہ سکتے ہیں، وہ شعر کی خوبی اور اُس کا حسن ہے جسے "سہل ممتنع" کہتے ہیں۔ میرزا صاحب نے بھی اسی صفت کو حسنِ بیان کی معراج قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:[2]

"سہل ممتنع اُس نظم کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اُس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہل ممتنع، کمالِ حسنِ کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع، در حقیقت ممتنع النظیر ہے۔
شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف نظم میں اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔
خود ستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا، تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔"

اپنے اشعار کے متعلق میرزا صاحب کا یہ خیال اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ وہ اُسے عام ریختہ اشعار سے جداگانہ قسم کا کلام مانتے تھے اور
میر و میرزا کے کلام سے بھی بالاتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ منشی نبی بخش حقیر کو یہ غزل:

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں / خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں!

بھیجی، تو اس کے ساتھ یہ بھی لکھا:[3]

"خدا کے واسطے داد دینا! اگر ریختہ یہ ہے، تو میر و میرزا کیا کہتے تھے؟ اگر وہ ریختہ تھا، تو پھر یہ کیا ہے؟"

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ اپنے اشعار ریختہ کو مذہبی اصطلاح میں سحر یا اعجاز بھی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ انھیں حقیر کو یہ غزل:

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے / یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

بھیجتے ہوئے، مستفسرانہ لکھا ہے:[4]

"داد دینا کہ اگر ریختہ یہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہونچے، تو اس کی صورت یہی ہوگی یا کچھ اور؟"

بھٹئی یا مدح

جو نقادِ مشرقی دربار کے سماجی اثرات سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ شعرائے مشرق کے لئے سلاطین کی مدح سے
راہ گریز نہ تھی اور شاہی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہر شاعر کو الفاظ و معانی کے باغ لگانا پڑتے تھے۔

بھی جذبۂ افسوس ہے جس کے تحت وہ مدح کے اشعار نسبتاً کم لکھتے اور تشبیب و عرضِ حال وغیرہ پر زیادہ زور دیتے ہیں
مدح اپنے حدود سے گزر کر بھٹئی نہ بن جائے، تاہم انھوں نے مجبوراً بھٹئی بھی کی۔

لیکن انھیں دو ہی اسباب کے تحت جو اُن کے پیشروؤں کو لاحق ہوتے تھے۔ یعنی جس نے کچھ دیا، یا جس سے کچھ ملنے کی امید
بندھی، اُس کی شان میں قصیدہ لکھا، اور جب یہ امید ٹوٹ گئی، اس رسم کو بند کر دیا۔ ظاہر ہے کہ بھٹئی ہی تھی، اسی لئے

[1] کلیاتِ نثر: ۸۳ — [2] عود: ۱۸۱ — [3] نادرات: ۲۶ — [4] ایضاً: ۴۲

وشکرو، سب ناجائز و نامستحسن، ایطا اور ایطا بھی قبیح ...... یاد رہے ساری غزل میں "مرواد"، "مستانہ" یا
ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل فقری ہوگی۔"

…زل کے اشعار کی زائد تعداد بھی پسند نہ تھی۔ فرماتے ہیں:[1]

"ایک بات اور تمھارے خیال میں رہے، میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بیت شاذ و نادر ہے، بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔"

…شعر

میرزا صاحب نے ایک میزانِ شعر مقرر کر دی تھی، تاکہ اُس پر فارسی و اُردو کے تمام شاعروں کے کلام کو پرکھا جا سکے۔ میزان یہ ہے:

…ودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک
…ضع پر ہے۔
…ھر حضرت سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے۔ سعدی و جامی و ہلالی، یہ اشخاص متعدد نہیں۔
…غانی ایک اور شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہائے نازک و معانی بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و
…رعی نے۔ سبحان اللہ! قالبِ سخن میں جان پڑ گئی۔
…س روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربہ دیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرے میں ہیں۔
…ودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا، اور سعدی کی طرز نے، بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔
…نداز پھیلا، اور اُس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں:
…اقانی، اُس کے اقران — (۲) ظہوری، اُس کے امثال — (۳) صائب، اُس کے نظایر۔
…ا الصاقبہ! ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام، ان تین طرزوں میں کس طرز پر ہے؟ بے شبہ فرماؤگے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ بس تو
…ایئے یہ طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے! خوب طرز ہے! اچھی طرز ہے! مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے۔ دار الضرب شاہی کا سکہ نہیں
…ال باہر ہے۔ واہ، واہ! انصاف، انصاف!

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار / زیک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادۂ بعضی حریفاں / خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر، کہ در اشعار ایں قوم / ورائے شاعری "چیزے دگر" ہست

…"چیزے دگر" پارسیوں کے حصہ میں آئی ہے۔ ہاں، اُردو زبان میں اہلِ ہند نے وہ چیز پائی ہے۔ میر تقی، علیہ الرحمۃ:

بدنام ہوگے، جانے بھی دو امتحان کو / رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

…ودا:
دکھلائیے لیجا کے تجھے، مصر کا بازار / خواہاں نہیں، لیکن کوئی واں جنسِ گراں کا

…ائم:
قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیونکر مانوں / ہے تو نادان، مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

…ے معلی: ۳۰۹ — خطوط: ۱: ۲۹۳۔

...تی کے نام کے خط میں اس کا خود بھی اعتراف کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

" اشعار تازہ مانگتے ہو۔ کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔

گورنمنٹ کا بھاٹ تھا۔ مدحیں کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، مدحیں متروک۔ رہی غزل، ہیچ"

ہزل و ہجو

میرزا صاحب کی سنجیدگی و خودداری نے اُن کے رواں دواں دماغ کو شاعری کی بلند سطح سے اُترنے کی اجازت نہیں دی۔ اسی لئے وہ بڑی حد تک ہزل و ہجو سے اپنا دامن بچائے گئے۔ خود بھی فرماتے ہیں:

" ہزل و ہجو میرا آئین نہیں "

تاہم اُن کے کلام فارسی میں متعدد ہجویہ قطعات موجود ہیں۔ ان میں سے صرف ایک کا مطالعہ اُن کا انداز ہجو معلوم کرنے کے لئے ...ہوگا۔ فرماتے ہیں:

کردۂ جہدے کہ در دیوانی کاشانہ ام — چرخ در آرایش ہنگامۂ عالم نکرد
گرچہ بہت راندہ باشم نکتہ ای برخود مپیچ — زانکہ حرفے زانچہ گفتم خاطرم خرم نکرد
بیخے از استاد دیدم، ذوقی بخشیدہ لیک — ہیچ در تسکین نیفزود و زوحشت کم نکرد
ہجو تو تا مت بے در صلب آدم دیدہ بود — زاں سبب ابلیس ملعون سجدہ بر آدم نکرد"

حاشاللہ بودنت در صلب آدم تہمت است
چیش ہرکس گفتم ایں اندیشہ باور ہم نکرد

اس سے بجا طور پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے انتہائی غم و غصے کے تحت دو چار اشخاص کی مذمت کر دی تھی۔ اس ...و دوسرے شعرا کی طرح اپنا آئین نہیں بنایا۔ علاوہ ازیں ان میں کسی شخص کا نام بھی نہیں لیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ...صاحب کا مقصود صرف دل کی بھڑاس نکالنا تھا، کسی کو بدنام کرنے اور بدنام رکھنے کے لئے ہجویہ شعر نہیں کہے تھے۔

...شعرگوئی

میرزا صاحب نے تقریباً ۱۸۶۱ء میں سرور کو لکھا ہے:

" میں اموات میں ہوں۔ مردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں، جو غزل کی روش ضمیر میں آئے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ ہائے! "انوری" گویا میری زبان سے کہتا ہے:

ای دریغا نیست ممدوحی سزاوار مدیح — ای دریغا نیست معشوقی سزاوار غزل

صناعت شعر اعضاء و جوارح کا کام نہیں، دل چاہئے، دماغ چاہئے، ذوق چاہئے، امنگ چاہئے، یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں۔

چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایت فن، اُس کے اسباب کہاں؟"

...م مارچ ۱۸۶۳ء کو تفتہ کے خط میں لکھا ہے:

" شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ دونوں کی فکر میں پریشان "

...ئے معلّی: ۳۵۵، خطوط: ۲/ ۳۲۱ - ایضاً - کلیات فارسی: ۱۰۰ - اُردوئے معلّی: [illegible]، خطوط: ۲/ [illegible] - خطوط: ۱/ ۲۰۰

واقعہ یہ ہے کہ جب تک میرزا صاحب مالی پریشانیوں میں مبتلا نہ ہوئے تھے، اُنھیں آزاد دل و دماغ، سرمستانہ ذوق شعر او... طبیعت کی جدت پسند امنگ حاصل تھی۔

میرزا صاحب کی اس پر کیف زندگی کا خاتمہ پنشن کے مقدمے کے آغاز پر ہوگیا۔ تاہم ابھی اُن کی شاعری کا شباب ولولہ و... مستی سے بیگانہ نہیں ہوا تھا۔ ہاں جب کلکتے سے ناکام واپس ہوئے اور پھر جنوری ۱۸۳۱ء میں مقدمہ اُن کے خلاف فیصل ہوا... تو مستقبل کے خوفناک تصور نے اُن کے دل و دماغ کو سخت اذیت پہنچائی اور پہلی بار اُن کی طبیعت نے فکر شعر و سخن سے تنفر کا اظہا... کیا۔ اب وہ غزل کہتے تھے، مگر دوستوں کے اصرار پر۔ اور قصائد بھی لکھتے تھے، مگر مالی پریشانیوں کو دفع کرنے کے لئے۔

۱۸۵۰ء میں قلعۂ معلّی سے تعلق قائم ہوا، تو میرزا صاحب کی شاعری میں پھر حرکت محسوس ہوئی، لیکن کچھ تو پژمردگیِ طبع کی... سے اور زیادہ تر شاہ ظفر کے مذاق سخن کے اتباع میں اُنھوں نے اُردو زبان میں زیادہ کہا۔ تاہم جو طبیعت افسردہ ہو کر مردہ ہوچک... تھی، اور جو دماغ جوانی سے گزر کر پیری کے حدود میں داخل ہوگیا تھا، وہ دوسروں کے سہارے کہاں تک ہمت اور جوش کا مظاہ... کر سکتا تھا۔ میرزا صاحب نے اس زمانہ میں بہت کچھ کہا، اور خوب خوب کہا، مگر یہ سب کچھ مجبوری سے کہا، اگر وہ اپنے آپ کو مالی مشکلا... میں گرفتار نہ پاتے، تو کبھی اس مشقت کو برداشت نہ کرتے۔ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء کو حقیر کو لکھتے ہیں:

" میں نے قصیدہ لکھنا موقوف کیا، مجھ سے لکھا ہی نہیں جاتا...... افسوس! تم کو میرے حال کی خبر نہیں۔ اگر دیکھو تو جانو۔ ع:۔ "جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا" کوئی دم ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو دم واپسیں کا خیال نہ ہو"

قدر بلگرامی کو ۲۳ فروری ۱۸۶۵ء کو تحریر فرماتے ہیں:

" باسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم و جان میں تاب و تواں نہیں"

۱۸۵۷ء کے مصائب جھیلنے کے بعد میرزا صاحب کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ ۱۷ اپریل ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں:

" بناوٹ نہ سمجھنا، شعر مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا"

انھیں کو پھر لکھتے ہیں:

" میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل اُلٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آ جاتا ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں، اور تنگ آتا ہوں، تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں:

اے مرگ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟"

جنون بریلوی نے فارسی اشعار کی فرمائش کی تھی۔ اس کے جواب میں ۸ ستمبر ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں:

ادبیات غالب: ۸۰ - خطوط: ۱/ ۱۷۷ - ایضاً: ۳۳ - ایضاً: ۴۸ - اُردوئے معلّی: ۲۱۰، خطوط: ۲۵۹ - خطوط: ۱/ ۱۸۰

"فارسی کیا لکھوں، یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر۔ ہزاروں کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے، پا بہ رکاب ہوں۔"[1]

اسی سال تفتہ کو ذرا صفائی کے ساتھ لکھا ہے[2]:

"بات یہ ہے کہ تم مشق سخن کر رہے ہو، اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بو علی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضایع اور بے فایدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے، اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہو گئے، ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا، کہ ہم تم کو ہوگا۔"

۲۳ مئی ۱۸۶۱ء کو مجروح کے خط میں انتہائی دردناک الفاظ میں فرماتے ہیں[3]:

"نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن خاں کہاں؟ ایک آزردہ، سو خاموش، دوسرا غالب، سو بے خود و مدہوش۔ سخنوری رہی، نہ سخن دانی۔ کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں جائے دلی!"

۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء کے بعد کسی تاریخ کو علائی کو لکھتے ہیں[4]:

"بھائی، تمھارا باپ بدگمان ہے۔ یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا سلام کہو اور یہ شعر پڑھ کر سناؤ:

گمان زیست بود بر منت ز بیدردی بدست مرگ، ولی بدتر از گمان تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر ہے، وہ ستمگر شعر و سخن کا طالب ہے۔ زندہ ہوتا تو وہیں کیوں نہ چلا آتا۔ مجھ پر سے یہ تکلیف اٹھواؤ، اور تم اس زمین میں چند شعر لکھ کر بھیج دو۔ میں اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ خدا کے واسطے پیر بجائے پسر۔"

اگلے سال تک ترک شعر گوئی نے تنفر کی شکل اختیار کر لی، اور ۱۹ جون ۱۸۶۳ء کو مرزا صاحب نے جنون بریلوی کو صاف لکھ دیا[5]:

"کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔"

اور جب تفتہ نے کسی غزل کی اصلاح کے سلسلے میں لکھا کہ آپ مجھے ایک مطلع لکھ دیجیے تو انھیں طنزیہ لکھا[6]:

"سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو۔"

۱۸۶۶ء میں مرزا صاحب کی یہ حالت ہو گئی کہ انھوں نے تفتہ کو لکھا[7]:

"شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔"

اور پھر ایک موقع پر ارشاد فرمایا[8]:

"کس ملعون نے بسبب ذوق شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی ہے؟ اگر میں شعر سے بیزار ہوں، تو میرا خدا مجھ سے بیزار!"

---

۱ خطوط ۱: ۲۸۰ — ۲ اردوے معلیٰ ۱: ۱۴۴، خطوط: ۳۰۰ — ۳ خطوط ۱: ۹۸ — ۴ انشاے نور چشم: ۵ — ۵ اردوے معلیٰ: [illegible] — ۶ [illegible] ۱: ۲۲۰ — ۷ خطوط ۱: ۹۲ — ۸ ایضاً: ۹۲ —

غالب کا آہنگ و لب ولہجہ

(...ز فتحپوری)

سب سے پہلے مجھے بتا دینا چاہیے کہ آہنگ اور لب ولہجہ سے میری کیا مراد ہے اور دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے
آہنگ کے لغوی معنی قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور کسی ایسی آواز کے بھی جو موقع محل کے لحاظ سے موزوں و مناسب ہو، اگر وہ
کے لحاظ سے نامناسب ہوگی تو اسے ناآہنگ کہیں گے۔

مناظر طبیعی میں بھی آہنگ ہوتا ہے، لیکن اس وقت فنون لطیفہ کی ہم آہنگی پیش نظر ہے جس میں قصد انسانی کو بھی دخل ہے
نقش میں رنگ و خطوط کی موزونیت یا ساز کے تاروں کا ایک سُر میں ملا ہونا یا مغنی کی آواز کا مناسب زیر و بم
کو لفظ خوش آہنگ سے تعبیر کریں گے۔ بالکل یہی حال شاعری کا ہے کہ اگر شاعر کسی شعر میں جذبات کے تقاضا کے لحاظ سے
الفاظ فراہم نہیں کرسکا، یا کسی مناسب بحر کے انتخاب سے ترنم نہ پیدا کرسکا تو ایسا شعر "ناآہنگ" قرار دیا جائے گا۔

لب ولہجہ بالکل دوسری چیز ہے۔ اس کا تعلق صرف زبان سے ہے، لیکن وہ آہنگ کا ضروری جزو بھی ہے اور جب تک
لہجہ آہنگ کا ساتھ نہ دے ادب پیدا نہیں ہوتا خواہ نظم ہو یا نثر۔ لب ولہجہ کو زبان میں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اس کے اختلاف سے
مفہوم ہی کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔

ہاں اور نہیں آپ ہر وقت بولتے ہیں، لیکن ان کا تلفظ آپ تعجب، استفہام یا طنز کے لہجہ میں کیجیے تو معنی بالکل بدل جائیں گے
اکبر الہ آبادی مرحوم نے اپنے پوتے کو تفنناً ایک شعر یاد کرا دیا تھا:

رقیب روسیہ کو ہم نے گاڑی ہانکتے دیکھا
وہ جھوٹا ہے جو کہتا ہے نہیں ہانکی، نہیں ہانکی

ایک دن صمد الہ آبادی نے جو داغ کے شاگرد اور بڑے خوشگو شاعر تھے، صاحبزادہ سے اس شعر کے پڑھنے کی فرمائش کی جب
چکا تو اکبر مرحوم نے ان سے کہا کہ آپ خود یہ شعر پڑھ کر انھیں سنائیے۔
صمد کو شعر پڑھنے میں کمال حاصل تھا، انھوں نے آخر مصرع کے دوسرے ٹکڑے "نہیں ہانکی، نہیں ہانکی" کو مختلف لہجوں
بیچ بار سنایا اور ہر مرتبہ ایک نیا مفہوم پیدا کیا۔

شعر خوانی ایک مستقل فن ہے، آج کل تو غزل کا گا کر پڑھنے کا رواج عام ہو گیا ہے، یہاں تک کہ ایک انتہائی کریہہ الصوت اور بدآواز
بھی ترنم ہی سے شعر سنانا چاہتا ہے، لیکن کچھ دن پہلے مشاعروں میں غزلیں اور مراثی سب تحت اللفظ پڑھے جاتے تھے اور محفل

میں سماں بندھ جاتا تھا۔ جن حضرات نے انیس و خاندان انیس کو مرثیہ پڑھتے سنا ہے، ان سے پوچھیے کہ وہ صرف لب ولہجہ سے کتنی زبردست
ساحری کر جاتے تھے۔ لیکن لب ولہجہ کا تعلق محض جنبش اعضا و حرکت جسم و ابرو یا آواز کے نشیب و فراز سے نہیں، بلکہ الفاظ سے بھی ہے
جب تک کوئی موزوں ماڈل سامنے نہ ہو، موزوں تصویر کشی ممکن نہیں، اور یہ موزوں ماڈل وہی الفاظ، وہی محاورات ہیں جو بلا
تکلف ایک صاحب زبان کے منہ سے بے اختیارانہ نکلتے رہتے ہیں اور بنیاد ہیں سہل ممتنع شاعری کی بھی۔
اب آپ انھیں دو باتوں کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ غالب کی شاعری کا کوئی خاص آہنگ اور لب ولہجہ ہے یا نہیں اور اگر
ہے تو کیا۔

یادگار غالب میں مولانا حالی نے غالب کے لب ولہجہ کے ذکر میں صرف ایک شعر پیش کیا ہے:

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

انھوں نے لکھا ہے کہ لفظ مکرر سے یہ مقصود ہے کہ پہلے مصرعہ کو ایک بار سوالیہ انداز میں پڑھیے اور پھر دوبارہ حسرت و ...
لہجہ میں۔ بات بڑی معقول ہے، لیکن متنازع نہیں اور اس کا تعلق شعر خوانی سے ہے الفاظ اور زبان سے نہیں۔

غالب کا اردو کلام بیان و معنی دونوں کا بڑا دلچسپ آمیزہ ہے، اگر اس کے بیان تصوف و بیدلانہ دقت پسندی کو
چھوڑ دیجیے تو بھی اس کی انفرادیت کو ابھارنے والی بہت سی خصوصیات اس کے کلام میں مل جاتی ہیں۔

اس وقت ہمارا مقصود اس کی تمام شاعرانہ خصوصیات پر گفتگو کرنا نہیں بلکہ صرف اس کے آہنگ ولب ولہجہ کو دیکھنا ہے۔
غالب کی شاعری دراصل معنی آفرینی اور ندرت تعبیر و خیال کی شاعری تھی، لیکن وہ زندہ ہے دراصل اپنی زبان کی شاعری جس کی
مثالیں اس کے اردو کلام میں بھی کافی مل سکتی ہیں۔

غالب کی ان غزلوں کو چھوڑ کر جو یکسر تصنع و تکلف ہیں، دوسری غزلوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں کوئی نہ کوئی ایک مص...
ضرور ایسا پایا جاتا ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ غالباً وہی سب سے پہلے اس کے ذہن میں آیا ہوگا اور پھر بعد کو اس نے...
غزل لکھی ہوگی۔

غالب کبھی اس کو پسند نہ کرتا تھا کہ وہ کسی دوسرے شاعر کی زمین کو سامنے رکھ کر غزل کہے، بلکہ خود اس کے ذہن میں جو بحر یا
ردیف و قافیہ آ جاتا اسی میں وہ فکر کرتا اور اکثر یہی ہوتا کہ اس کی بنیاد کوئی محاورہ ہوتا یا کوئی ایسا لفظ جو لب ولہجہ سے تعلق رکھ...
ہے۔ کبھی کبھی کوئی پورا مصرع کسی خاص آہنگ لب ولہجہ کا اس کے ذہن میں آ جاتا اور یہی بنیاد ہوتا پوری غزل کا۔ مثلاً اس کی پہلی
غزل لیجیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سب سے پہلے یہ مصرع اس کے ذہن میں آیا ہوگا:

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جو خوش آہنگ بھی ہے اور تاثر لب ولہجہ بھی رکھتا ہے۔

اسی طرح چھٹی غزل میں تیسرے شعر کا یہ مصرع بنیادی حیثیت رکھتا ہے:

جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

پھر اسے فکر غالب کا اعجاز کہیے یا فیض روح القدس کہ اس کا پہلا مصرع ایسا ہاتھ آگیا کہ پورا شعر حسن خیال و حسن بیان...

یزہ نقش بن گیا جس میں آہنگ ولہجہ دونوں کا نہایت لطیف امتزاج پایا جاتا ہے:

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

اس میں صرف تین فقرے فارسی ترکیب کے ہیں جن سے کوئی جملہ نہیں بنتا، لیکن پورے شعر کو پڑھئے اور غور کیجئے کہ یں کتنا لطیف لب ولہجہ اظہارِ حسرت کا پنہاں ہے۔

ساتویں غزل کا بنیادی مصرع میری رائے میں یہ ہے:

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

لیکن اس کو بلندی پر پہونچایا پہلے مصرع نے:- کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے

اتفاق سے اسی انداز کا ایک اور شعر اس زمین میں ہو گیا:

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ان دونوں شعروں میں کوئی معنی آفرینی نہیں، کوئی جدتِ خیال نہیں، لیکن محض آہنگ اور لب ولہجہ کے دلکش امتزاج یں جادو بھر دیا ہے۔

ئیسویں غزل کا بنیادی مصرع یہ ہے:

در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

و غالباً بیدل کی فارسی ترکیب "بیاباں می چکد" کا تصرف ہے۔ لیکن غالب نے اس کا ترجمہ "ٹپکے ہے" کرکے اسے اردو ہ بنا دیا اور ایک خاص لب ولہجہ اس کو عطا کیا

مصرع: گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانہ کی اتنا ہم آہنگ نہیں۔ اگر وہ ٹپکنے کی رعایت سے کر نہ کرتے تو شعر زیادہ بلند ہو جاتا۔

بیسویں غزل کا بنیادی مصرع غالباً یہ ہے:

پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

لیکن جس تصور سے اس میں کام لیا گیا ہے وہ بالکل بے جان رہتا اگر پہلا مصرع: "دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز" تا، گو قیامت کے ذکر کی کوئی وجہ بظاہر نظر نہیں آتی۔

س زمین کا دوسرا شعر یہ ہے:

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہگزر یاد آیا

ہ آہنگ اور لب ولہجہ کے لحاظ سے غزل کی جان ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ شعر پورا کا پورا اس کے ذہن میں القا ہوا ہو۔

---

۳۶ ویں غزل کا شعر ہے:

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

پورا شعر ایک خاص لب ولہجہ ایک خاص تیور رکھتا ہے جس کو پہلے مصرع کے لفظ "اللہ اللہ" اور دوسرے مصرع کے اس قد سے اُبھارا گیا ہے۔

---

۳۸ ویں غزل پوری کی پوری لطفِ زبان و سادگیِ بیان کی تصویر ہے، لیکن زیادہ تر دوسرے مصرعوں کی حد تک، پہلے مصرعو کی خیال آرائی نے غزل کو کافی گرانبار کر دیا ہے۔ کتنا پیارا مصرع ہے:

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

لیکن پہلے مصرع: "دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر" نے اس کو اتنا بوجھل کر دیا کہ شعر غارت ہو گیا۔

اسی طرح: "تغافلہائے ساقی کا گلہ کیا" کتنا دلنشین اندازِ بیان ہے، لیکن پہلا مصرع:۔ "نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے" کتنا ناآہنگ!

اس غزل کا مقطع البتہ اس نقص سے پاک ہے:

کیا کس نے جگرداری کا دعوےٰ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا؟

جس کے حسن کی بنیاد صرف "بھلا کیا" کے لب ولہجہ پر قائم ہے۔

---

۴۰ ویں غزل کا ایک شعر ہے:

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں، ان کو دکھلادوں انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

پہلا مصرع نہ ہو تو دوسرا مصرع بیکار ہے۔ اس کو کہتے ہیں شاعری میں الفاظ کی "دست و گریبانی" کہ آپ کسی لفظ کو نکال کر دوسرا اس کی جگہ لا ہی نہیں سکتے۔ خاص کر "جاؤں" کہ اس پر پورے مضمون کی بنیاد قائم ہے۔

---

۴۳ ویں غزل پوری کی پوری "آہنگ و لب ولہجہ" کا بڑا لطیف امتزاج ہے، خصوصیت کے ساتھ یہ شعر:

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

لیکن افسوس ہے کہ استوار اور دوچار قافیے والے اشعار آہنگِ غزل سے ہٹ گئے:

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

جن میں تکلف و تصنع یا ادعائے بیجا کے سوا کچھ نہیں۔

اس کے بعد کی غزلیں ردیف الف کی سب زبان و بیان کے لحاظ سے حد درجہ خوش آہنگ ہیں:

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے،
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

لیکن انھیں زمینوں کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو غزل کے مزاج کے خلاف ہیں۔ مثلاً:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما،
کام گر رک گیا روا نہ ہوا

ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

۵۰ویں غزل کا مطلع و مقطع ملاحظہ فرمائیے:

حُسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

پہلے شعر سے لفظ بارے اور دوسرے سے "کس کے گھر جائے گا" نکال دیجئے، دونوں شعر بے جان ہو جائیں گے۔

۶۳ویں غزل کا بنیادی مصرع ہے:

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

لیکن اس کا پہلا مصرع:

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر

غالب ہی کہہ سکتا تھا۔ لیکن اس بلندی کو اُبھارا "گرنی تھی" کے لب و لہجے نے۔

۰۰ویں غزل غالب کی نہایت معروف و مقبول غزل ہے اور اس کے تمام اشعار بڑے لطیف و پاکیزہ ہیں لیکن اس کا
ہی ایک شعر ہے جو زبان و محاورہ سے تعلق رکھتا ہے:

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

خاک ہو جائیں گے" کو ہٹا کر کوئی دوسرا جملہ اس کی جگہ رکھ کر دیکھئے۔ سارا لطف خاک ہو جائے گا۔

۱۰۳ویں غزل کے دو شعر:

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

ری غزل کا ماحصل ہیں، لیکن محض اس لئے کہ ان کی بنیاد خالص زبان اور "بات بگڑ جائے" اور "ظلم کر ظلم" کے لب و لہجہ پر قائم ہے۔

۱۰۴ویں غزل کا ایک شعر ہے:

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں؟

پورے مضمون کی بنیاد دوسرے مصرع کے سوالیہ لب و لہجہ پر قائم ہے۔

۱۱۱ویں غزل کا ایک شعر ہے:

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے،
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اس شعر میں لو کی جگہ ہاں رکھ کر دیکھئے، تو زمین و آسمان کا فرق ہو جائے گا، کیونکہ لو کے اندر جو لب و لہجہ نہاں ہے، وہ ہاں میں نہیں ہے۔

۱۱۵ویں غزل کے دو شعر ہیں:

کوئی کہے کہ شب مہ میں کیا برائی ہے،
بلا سے دن کو اگر ابر و باد نہیں

تم ان کے وعدہ کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

پہلے شعر میں کوئی کہے اور بلا سے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں یہ کیا۔ بالکل زبان اور لب و لہجہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی شعر کی جان ہیں۔

۱۲۳ویں غزل کے دو شعر ہیں:

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن خدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو

مرتا ہوں کے مفہوم میں جو وسعت، سب درست میں جو لطیف طنز، اور خدا کرے میں جو شدتِ تمنا پائی جاتی ہے اس کا اظہار کسی دوسرے طریقہ سے ممکن ہی نہ تھا۔

اس میں شک نہیں الفاظ کی ساخت صرف عروض سے ہوتی ہے لیکن معنوی حیثیت سے اصل چیز لب و لہجہ ہے جس کے تغیر سے مفہوم بھی بدلتا رہتا ہے۔

غالب کی ایک مشہور غزل کا شعر ہے:

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان خدا ہے،

اس شعر کی جان صرف مری جان ہے، جس میں تسلی و تشفی کی ایک دنیا آباد ہے۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے

[…]شعر کی تمام جذباتی و معنوی خوبیوں کی بنیاد صرف لفظ تو ہے، اس کو نکال دیجئے، شعر کی ساری تعمیر درہم برہم ہو جائے گی۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم　　میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

[…]س موقع پر "میرا سلام کہیو" ایک اہلِ زبان ہی لکھ سکتا تھا دوسرا کیا سمجھ سکتا ہے کہ اس کے لب و لہجہ میں یہاں […]ست طنز پنہاں ہے۔

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار، دیکھنا　　تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

[…]س شعر میں دیکھنا کی وسعتِ مفہوم صرف سمجھی جا سکتی ہے۔ بیان نہیں کی جا سکتی۔

[…]ب ہی غزل کے دو شعر ہیں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

[…]دونوں شعروں میں پر کا مفہوم اور لب و لہجہ ایک دوسرے سے جدا ہے۔

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا　　میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

[…]ں میں سارے مفہوم کا انحصار لفظ اور پر ہے۔ اس کی جگہ ورنہ بھی کہہ سکتے تھے، لیکن اور سے کچھ اور بات پیدا ہوتی […]تعلق صرف لب و لہجہ سے ہے۔

[…]ب کو آخر آخر زبان اور اس کے لب و لہجہ سے اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے بعض غزلوں کی ردیف اور قوافی […]کھے کہ وہ زبان و لب و لہجہ کا لطف پیدا کر سکے، مثلاً:

[…]دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا
[…]دل پہ بار تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
[…]دستِ غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
[…]کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
[…]جو مرنا تو جینے کا مزا کیا
[…]تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
[…]رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
[…]سے باز آئے، پر باز آئیں کیا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
کب وہ سنتا ہے کہانی میری
سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے

ان زمینوں میں غالب کی تمام غزلیں زبان، روزمرہ، آہنگ اور لب و لہجہ کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

انتخاب کلام فارسی

(...تحپوری)

اے بخلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا — باہمہ در گفتگو بے ہمہ با ماجرا
آب نہ بخشی بزور خون سکندر ہدر — جان نہ پذیری بہیچ نقد خضر نا روا
بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب — ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

بطاعت شادم ازیں خجالت چوں بروں آیم — کہ رشکم در جحیم افگند خلد آرامگاہاں را

خاموشی ما گشت بد آموز بتاں را — زیں پیش وگرنہ اثرے بود فغاں را
بر طاعتیان فرخ و بر عشرتیاں سہل — نازم شب آدینۂ ماہ رمضاں را

حال ما از غیرے پرسی و منت می برم — آگہی باری کہ آگہ نیستی از حال ما
جان غالب تاب گفتارے گدازی ہنوز — سخت بیدردی کہ میپرسی ز ما احوال ما

مکن ناز و ادا چندیں دلی بستان و جانے ہم — دماغ نازک من برنتابد تقاضا را
دل مایوس را تسکیں بردن میتواں دادن — چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را
خلق بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن — ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

نیست مستاں را تفرقہ بدر و ہلال — بادہ مہتاب بود در شب آدینۂ ما

جوئی از بادہ و جوئی ز عسل دارد خلد — لب لعل تو ہم انیست و ہم آنست مرا
خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت — منتے بر قدم راہروانست مرا
رہرو نقشہ در رفتہ و آیم غالب — توشۂ بر لب جو ماندہ نشانست مرا

می پرد مور گر جاں بسلامت ببرد — تا چہ برقست کہ در نازد و خرمن ما

با بندۂ خود ایں ہمہ سختی نے کنند — خود را بزور بر تو گر بستہ ایم ما
بر روئے حاسداں در دوزخ کشودہ رشک — از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما
ازبسکہ خاطر ہوس گل عزیز بود — خوں گشتہ ایم و داغ و بہار خودیم ما
با چو توئی معاملہ بر خویش منت ست — از شکوۂ تو شکر گزار خودیم ما
در کار ماست نالہ و ما در ہوائے او — پروانۂ چراغ مزار خودیم ما

بت مشکل پسند از ابتذال شیوہ میرنجد — بگوئیدش کہ از عرض آخر بیوفائیہا
سخن کوتہ مرا ہم دل بتقوی مائلست اما — زننگ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا
زاہد مناز چہ بندیں ز نارم ارگسستی — از جبہ ام نہ دزدد کس سجدۂ صنم را

من آں نیم کہ دگر می تواں فریفت مرا — فریبش کہ مگر می تواں فریفت مرا
زور و دل کہ با فسانہ در میاں آید — بہ نیم جنبش سر می تواں فریفت مرا
نباز نامہ ان نامہ بر خوشم ہنوز — بہ آرزوئے خبر می تواں فریفت مرا
شب فراق ندارد سحر ولے یکچند — بہ گفتگوئے سحر می تواں فریفت مرا
سرشت من بود ایں ورنہ آں نیم غالب — کہ از وفا بہ اثر می تواں فریفت مرا

زمن گرت نبود باور انتظار بیا — بہانہ جوی مباش و ستیزہ کار بیا
زا گسستی دیا دگراں گر دستے — بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا
وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد — ہزار بار برو صد ہزار بار بیا
فریب خوردۂ نازم چہا نمیخواہم — یکے بہ پرسش جان امیدوار بیا
ز خوئے تست نہاد شکیب نازک تر — بیا کہ دست و دلم میرود ز کار بیا
حصار عافیتی گر ہوس کنی غالب — چو ما بہ حلقۂ رندان خاکسار بیا

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را — رشک نگذارد کہ گویم نام را
بلکہ ناہم بیرد از من مرنج — من بہستی بستہ ام احرام را

ترسم کہ دو نالہ جگر را بدریدن — قطع نظر از جیب بدو ذیلیم را

خوشا جانے کہ افتد چو فرو گرد سراپایش — ز نومیدی تواں پرسید لطف انتظارا را
طول سفر شوق چہ پرسی کہ در ایں راہ — چوں گرد فرو ریخت صدا از جرس ما
خرسندی غالب نبود زیں ہمہ گفتن — یکبار بفرمائے کہ اے ہیچکس ما

نازم تا چہ برق فتنہ خواہد ریخت بر چشم — تصور کردہ ام گستن بند نقابش را
نازم تا چساں از عہدۂ در دش بروں آیم — زشادی جاں بہا گفتم متاع کم بہایش را

تو زود مستی و ما باز داز خوئے تو ایم — شراب در کش و پیمانہ کن حوالۂ ما
درازی شب ہجراں ز حد گذشت بیا — فدائے روئے تو عمر ہزار سالۂ ما

چو غنچہ جوشش صفائی تنش زبالیدن — دریدہ بر تن نازک قبائے تنگش را

سوزد زبسکہ تاب جمالش نقاب را — دانم کہ در میان نپسندد حجاب را
نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست — گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را
آتش دہم بہ بادہ و داد ہم دم از تمیز — نوشد می و ز جام فرو ریزد آب را

آسوده باد خاطر غالب که خوی اوست / آمیختن به بادهٔ صافی گلاب را

چمن ساماں بہ دارم که دارد وقت گلچیدن / خرامی کز ادای خویش پُر گل کرده داماں را

بادهٔ مشکبوی ما بید و کنار کشت ما / کوثر و سلسبیل ما طوبی ما بهشت ما

باده اگر بود حرام بذله خلاف شرع نیست / دل نهی بخوب ما طعنه مزن بزشت ما

شبم تاریک و منزل دور و نقش جاده ناپیدا / بلا کم جلوهٔ برق شراب گاه گاهی را

گر به معنی نرسی جلوهٔ صورت چه کمست / خم زلف و شکن طرف کلاهے دریاب

تا چها آئینهٔ حسرت دیدار تو ایم / جلوه بر خود کن و ما را به نگاهی دریاب

فرصت از کف مده و وقت غنیمت پندار / نیست گر صبح بهاری شب ماہے دریاب

شیوه‌ها دارد و من معتقد خوے ویم / نشوقم از رنجش او گر بفزاید چه عجب

خوشست افسانهٔ درد جدائی مختصر غالب / به محشر میتواں گفت آنچه در دل مانده است امشب

سحر دمیده و گل در دمیده است مخسپ / جهاں جهاں گل نظاره چیده است مخسپ

ز خویش حسن طلب بیں و در صبوحی کوش / بہ شانه زلف در چلیپه است مخسپ

نفس ز ناله بہ سنبل درود است بخیر / ز خون دل مژه در لاله چیده است مخسپ

بذکر مرگ شبے زنده داشتن ذوقیست / گرت فسانهٔ غالب شنیده است مخسپ

جنت نکند چارهٔ افسردگی دل / تعمیر باندازهٔ ویرانی ما نیست

رشک آیدم بروشنی دیده‌ہائے خلق / دانسته ام که از اثر گرد راه کیست

بیخود بوقت ذبح تپیدن گناه من / دانسته دشنه تیز نکردن گناه کیست

دلم بعهد وفائی فریفت نامه سپار / خوش ست وعدهٔ تو گرچه از زبان تو نیست

شکست رنگ تو از عشق خوش تماشائیست / بهار دهر برنگینیٔ خزان تو نیست

رواں فدائی تو نامم که بردهٔ ناصح / زہی لطافت ذوقیکه در بیان تو نیست

گمان زیست بود بر منت ز بیدردی / بدست مرگ شے بدتر از گمان تو نیست

نظم و نثر شورش انگیزے که می باید بخواه / ایکه میپرسی که غالب در سخن یکتاست هست

سینه بکشودیم و خلقے دید کاینجا آتشست / بعد ازیں گویند آتش را که گویا آتشست

بی تکلف در بلا بودن به از بیم بلاست / قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتشست

پاک خور امروز و زنهار از پے فردا منه / در شریعت باده امروز آب و فردا آتشست

صلائے قتل ده و جانفشانی ما بیں / برائے کشتن عشاق وعده بسیارست

بشب حکایت قتلم ز غیرے شنود / هنوز فتنه بذوق فسانه بیدارست

غم شنیدن و لختے بخود فرو رفتن / چو قفرهٔ که هنوز نش وجود در تارست

در پردهٔ تو چند کشم ناز عالمی / داغم ز روزگار و فراق بهانه ایست

هرچه فلک نخواست هیچکس از فلک نخواست / ظرف فقیه می نجست بادهٔ ما گزک نخواست

جاه ز علم بے خبر علم ز جاه بے نیاز / هم محک تو زر ندید هم زر من محک نخواست

بحث و جدل بجائے ماں میکده جوئے کاندراں / کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

رند هزار شیوه را طاعت حق گراں نبود / لیک صنم بسجده در ناصیه مشترک نخواست

دارم و ے ز آبله نازک نهاد تر / آهسته پانهم که سر خار نازک ست

امشب آتشیں روئے گرم زند خوانیهاست / گوئی لبش نوا بردم درشرر فشانیهاست

درگشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن / اینکه من نمی میرم هم ز ناتوانیهاست

گفته دل خوشم که بستمگراں کمبر / دید دلفریبیها گفت مهربانیهاست

داغم از سرانجام رخ نهفته بگذشتن / هاں وہاں فدا دشمن آنچه بدگمانیهاست

باعدو عتا بستی و زخش حجابستے / در چه دلربائیهاهی چه جانستانیهاست

با چنیں تهیدستی بهره چه بود از هستی / کار ما ز سرمستی آستیں فشانیهاست

سرگرمی خیال تو از ناله باز داشت / دل پاره آتشیست که دودش نماند است

دل را بوعدهٔ سخنے می تواں فریفت / تا زیک بروفائے تو بودش نمانده است

بلبل دلت بنالهٔ خونیں بہ بند نیست / آسوده زی که یار تو مشکل پسند نیست

عهد وفا ز سوئے تو تا استوار بود / گلشتی و ترا بہ شکستن گزند نیست

بیخود بزیر سایهٔ طوبے غنوده اند / رشکیم رهرواں تمنا بلند نیست

خویش را صورت پرستاں بهرزه رسوا کرده اند / جلوه می نامند و در معنی نقابے بیش نیست

جلوه کن منت منه از ذره کمتر نیستم / حسن را ایں تابنا کی آفتابے بیش نیست

وائے لب گر دل ز تاب تشنگی نگه از دم / میگساراں مست و من مخمور و ساقی غافلست

هم وعده و هم منع ز بخشش چه حساب ست / جاں نیست که مرر نتواں داد شرابست

هرچه از گریه فشاندیم بہ نفشردن ریخت / هرچه از ناله رسانیدیم بہ شنودن رفت

شست و شو مشغلهٔ شوخی ابر کرم ست / وه زآں خرقه که با داغ میآلودن رفت

بجرم دیدهٔ خونبار کشته ما را / ترا ز دامن و ما را ز آستیں پیداست

گلفت تلخ رشک تمنائے خویشتن / شادم که دل ز وصل تو نومید بوده است

یاد در عهد شبابم بکنار آمد و رفت / همچو عیدے که در ایام بهار آمد و رفت

گفتم البته ز من شاد بمردن گردی / گفت دشوار که مردن بتو آساں شده است

شنیدۂ کہ بآتش نسوخت ابراہیم | ببیں کہ بے شرر و شعلہ میتوانم سوخت
مراد میدنِ گل در گماں فگند امروز | کہ باز بر سر شاخِ گل آشیانم سوخت
نوید آمدنت رشک از قفا دارد | شگفتہ روئی گلہائے بوستانم سوخت
گمر پیام عتابے رسیدہ است از دوست | شکستہ رنگی یاران راز دانم سوخت
خبر دہید بقاتل کہ ہجری گشتم | ز ماہتاب چہ منت برم کتانم سوخت

بایدبغم نخوردن عاشق معاف داشت | آنرا کہ دل ربودن و نشناختن بہ بیست
تاثیر آہ و نالۂ مسلم ولے مترس | مارا ہنوز عربدہ با خویشتن بہ بیست

چو صبح من ز سیاہی بشام مانند ست | چگوئیم کہ زشب چند رفت یا چند ست
نگفتۂ کہ بتلخی بساز و پند پذیر | برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند ست
نگاہ مہر بدل سر نداد چشمۂ نوشش | ہنوز عیش باندازۂ شکر خند ست
ز بیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی | نگوید ارچہ بہ برگ من آرزومند ست
نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب | بدیں کہ بوسہ دہد گو بدہ ہست خرسند ست

بپہلو بنگافید و ببینید دلم را | تا چند بگویم کہ چنان ست و چنان نیست

دل بُرد و حق آنست کہ دلبر نتوان گفت | بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت
پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتوان خواند | ہموارہ تراشد بت و آذر نتواں گفت
آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است | بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت
کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا | مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت

خواست کوما رنجد و تقریب رنجیدن نداشت | جرم غیر از دوست پرسیدیم و پرسیدن نداشت
بود آدم از امانت ہرچہ گردوں بر نتافت | ریختے بر خاک چوں در جام گنجیدن نداشت

کلید بستگی تست غم بجوش اے دل | تو گر جبیں نگدازی گرہ کشای تو کیست
بانتظار تو در پاس وقت خویشتنم | فریب خوردۂ نیرنگ وعدہ ہای تو کیست

بدیں نیاز کہ باتست ناز میرسدم | گدا بسایۂ دیوار پادشا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز | گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست
درازی شب و بیداری من ایں ہمہ نیست | ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست
ببیں ز دور و مجو قرب شہ کہ منظر را | دریچہ باز و در پردہ باز و اژدہا خفتست

منت از دل نمیتواں برداشت | شکر ایزد کہ نالہ بے اثر ست
قفس و دام را گنا ہے نیست | ریختن در نہادِ بال و پر ست
ریزد آں برگ و ایں گل افشاند | ہم خزاں ہم بہار در گذر ست

آنکہ بے پردہ بصد داغ نمایانم سوخت | دیدہ پوشید و گماں کرد کہ پنہانم سوخت
نہ بد رجستہ شرارہ نہ بجا ماندہ رماد | سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

مستم ز خون دل کہ دو چشم ازاں پُرست | گوئی مخور شراب و نہ بینی بجام چیست
دلخستۂ غمیم و بود دوای ما | با خستگاں حدیث حلال و حرام چیست
نیکی ز تست از تو نخواہیم مزد کار | در خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست

بانگ صور سر از خاک بر نمی دارم | ہنوز در نظرم چشم نیم خوابے ہست
بہار ہست بود بر شگال ہاں غالب | دریں خزاں کدہ ہم موسم شرابے ہست

دریں روش بچہ امید دل تواں بستن | میانۂ من و او شوق حائل افتاد ست
چو اندر آئینہ با خویشتن لا بسازش نو | ز خود بروئے کہ مارا چہ در دل افتاد ست

با دو خاک رہ گزر بر فرق عریاں ریختیں | گل کسی جوید کہ او را گوشۂ دستار ہست
در خموشی تابشِ روی عرق ناکش نگر | تا چہا ہنگامۂ سر گرمی گفتار ہست

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں مارا | قدم بہ بتکدۂ و سر بر آستانۂ تست
نوائے کہ محو سخن گستران پیشینی | مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

اے حسن گر از راست نہ ز نگی سخنے ہست | ناز اینہمہ یعنی چہ گر ہیچ و دہاں ہیچ
تن پروری خلق فزوں شد ز ریاضت | جز گرمی افطار ندارد رمضاں ہیچ

اے جمال تو بتاراج نظرہا گستاخ | دی خرام تو بپامالی سرہا گستاخ
مردم از ورد تو دو راز تو داغم از غیر | کہ رساند بتو ایں گونہ خبرہا گستاخ
ہائے ایں پنجہ کہ با جیب کشاکش دارد | بود با دامن پاکت چہ قدرہا گستاخ

بہشت خویش توانی شدن اگر داری | دلے کہ خوں شود و رنگ مدعا ریزد

فرو نیادم از آنکہ نجو دم بطلب | ہزار بار گذارم بر آشیاں افتاد

اے کہ بدیدہ ام ز تست و لے کہ بسینہ غم ز تست | نازش غم کہ ہم ز تست خاطر شاد میدہد
مست عطائے خود کند ساقی ما ز دست ے | دادہ زیاد می برد بسکہ زیاد میدہد

نشاط انگیزی انداز ستی چاک را نازم | بہ پیراہن نمی گنجید گریبانے کہ داماں شد
خدا را اے بتاں گردوں گر دینی دارد | دریغا آبروے دیر گر غالب مسلماں شد

زبستم ہیچ و زیں ننگ نہ گشتم خود را | جاں فدائے تو مباد کہ ز تو حیائے آید

گلشت را نواز گست را تماشا | تو داری بہارے کہ عالم ندارد

گردیم شرح عتابے کہ بد اہبا داری | دود از کار گہ شیشہ گراں برخیزد
گردیم شرح ستمہائے عزیزاں غالب | رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

گوہر چہ شکایت کند از بے پروبالی
ماییم و سرشکے کہ چکیدن نشناسد

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

در دام بہر دانہ نیفتم مگر قفس
چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

از نالہ ام مرنج کہ آخر شدست کار
شمع خموشم و ز سرم دود میرود

نازم بامتیاز کہ بگزشتن از گناہ
با دیگراں ز عفو و بما از غمزہ بود

مجنوں تپیدۂ ذوق نگاہ نتواں زیست
شہید آں مژہ ہائے دراز باید بود

زجوش دل بنوازش رسیدہ ور آبست بندی
بمژگاں قطرۂ خوں غنچہ تا چیدہ را ماند

آلودۂ ریا نتواں بود غالبا
پاکست خرقۂ کہ بمے شست و شو کنند

پیداست بے نیازی عشق از فنائے ما
گر زورقے شکست ز دریا چہ میرود

یک رہ اگر بوادی مجنوں کند گزار
از ساربان ناقۂ لیلا چہ میرود

ہفت آسماں بگردش و ما در میانہ ایم
غالب دگر مپرس کہ برما چہ میرود

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نمی آید
بتوئے گفت می آیم کہ پیدا ام نمی آید

دوش کز گردش انجم گلہ بر روئے تو بود
چشم سوی فلک و روئے سخن سوئے تو بود

مردن و جاں بتمنائے شہادت دادن
ہم ز اندیشۂ آزردن بازوئے تو بود

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز
گر ز رہ بد کہ با محرم دو تنہا ماند

یک گریہ پس از ضبط دو صد گریہ نشادہ
تلخی آں زہر توانم ز گلو برد

دشوار بود مردن و دشوار تر از مرگ
آنست کہ من میرم و دشوار نماند

پیمانہ برآں رند حرامست کہ غالب
در بیخودی اندازۂ گفتار نداند

دہ بمجلسیاں بادہ و چوں نوبت من
بمن نیاید و در انجمن فرو ریزد

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانی عمری کہ در سفر گزرد

می بہ زاہد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیش ایں قوم بشورابۂ زمزم نرسد

خواجہ فردوس بمیراث تمنا دارد
وائے گر در روش نسل بہ آدم نرسد

گفتم گرہ ز کار دل و دیدہ باز کن
از جیب ناکشودہ بہ بند نقاب زد

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایمان میرود

آید و از ذوق شناسم کہ کیست
تا رود چنداں شتم جاں میرود

نومیدی ما گردش ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

بلبل بچمن بنگر و پروانہ بمحفل
شوقست کہ در وصل ہم آرام ندارد

بوسے کہ ربائیدہ بمستی ز لب یار
نفرینے و نے لذت دشنام ندارد

برند دل بادائے کہ کس گماں نبرد
فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دارانند

دلستاناں نخلند ار چہ جفا نیز کنند
از وفائے کہ نکردند حیا نیز کنند

اندراں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گزشت
کاشکے با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

حلق غالب نگر و دشنۂ سعدی کہ بنو
خوبرویان جفا پیشہ وفا نیز کنند

گفتند حور و کوثر و دادند ذوق کار
منت نام شاہدے آشکار برد

نازم فریب صلح کہ غالب ز کوئے تو
ناکام رفت و خاطر امیدوار برد

دریغا کہ کام و لب از کار ماند
سخنہائے ناگفتہ بسیار ماند

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر
نومیدیم دگر چو امیدوار کرد

با ملک میاویز ای پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

شائستہ ہمیں ما و تو بودیم کہ تقدیر
ما را سخن نغز و ترا روئے نکو داد

ساقی دگرم برد بمیخانہ ز مسجد
می یک ز قدح بود و فریبم بسبو داد

تو تانی از خلد خار و تنگی کہ سپہر
سر حسین علی بر سناں بگرداند

نمے از می با بفرست و انگہ ہرقدر خواہی
رواں کن جوی از شیر و دل از پرہیزگاراں بر

مرا گوئی کہ تقوی ورز قربانت شوم خود را
بیارائی و بگلگونۂ تقوی شعاراں بر

خار ہا در رہ سودازدگاں خواہد ریخت
درشت در کوہ و بیاباں بچہ کارست بہار

بیا و جوشش تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر

زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امیدنیم
ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر

دمید دانہ و بالید و آشیاں گم شد
در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

اگر ہوائے تماشائے گلستاں داری
بیا و عالم در خوں تپیدنم بنگر

بہار من شو و گل گل شگفتنم دریاب
بخلوتم برو ساغر کشیدنم بنگر

بخود شمار وفا ہائے من ز مردم پرس
بمن حساب جفا ہائے خویشتن یاد آر

اے دل از گلبن امید نشانے بمن آر
نیست گر تازہ گلے برگ خزانے بمن آر

برنے کہ جانہا سوختن دل از جفا سروش بیں
شوخی کہ خونہا ریخت دست از حنا پاکش نگر

آں سینہ کز چشم جہاں مانند جاں بودی نہاں
اینک بپیراہن عیاں از روزن چاکش نگر

خواند بامید اثر اشعار غالب ہر سحر
از نکتہ چینی در گزر فرہنگ و ادراکش نگر

ہر برق کہ نظارہ گداز ست نہادش
بگزار و بہ پیمانۂ ذوق نظرم ریز

باده بوام خورده و زر بقمار باخته — وه که ز هرچه ناسزاست هم بسزا نکرده ایم
تا بچه مایه سرکشیم ناله بعذر بی غمی — از نفس آنچه داشتیم صرف ترانه کرده ایم

خار ز جاده باز چیں سنگ بگوشه در فگن — در سر ره گزرتش ترک بهانه کرده ایم

گر فراموشی بفریادم رسد وقتست وقت — رفته ام از خویشتن چندانکه در یاد خودم
صید هم دل راز بیدادت فریب التفات — ساده گی بنگر که در دام تو صیاد خودم

خون خود اجزای زمانی در فشار بیخودی — رفت ایامی که من امسال و پاری داشتم
دیگر از خویشم خبر نبود تکلف برطرف — اینقدر دانم که غالب نام یاری داشتم

زاهد خوش نشست صحبت از آلودگی مترس — کاین خرقه بارها بمی ناب شسته ایم
ای در عتاب رفته ز بیرنگی سرشک — غافل که امشب از مژه خوناب شسته ایم

با تو عرض وعده ات حاشا که از ابرام نیست — هرچه میگوئی همی خواهم که تکرارش کنم
راحت خود جستم و رنج فراوان یافتم — مژده دشمن را اگر جهدیست در آزارش کنم
در غمش خوی به بسر بردم ز دعوی شرم نیست — فرصتی کو کز وفای خود خبردارش کنم

آئینه دگر شکسته تمنا حسرت ست — یک کاشکی بود که بصد جا نوشته ایم

دیدیم که مستی اسرار ندارد — رفتیم و به پیمانه فشردیم جگر هم
تابند نقاب کشودست که غالب — رخساره بناخن صله دادیم و جگر هم

رنگها چون شد فراهم مصرفی دیگر نداشت — خلد را نقش و نگار طاق نسیان کرده ایم
زاهد از ما خوشه تاکی بچشم کم مبین — بے شیدائی که یک پیمانه نقصان کرده ایم
کشتی بی ناخدایم سرگذشت من مپرس — از شکست خویش بر دریا کنار افتاده ایم

عرصه شوق ترا وحشت غباریم ما — تن چو بریزد ز هم هم بتپیدن دهیم
دل زجوش گریه گر برخویشتن بالد رواست — قطره بودست و بحر بیکرانش کرده ام

میربایم بوسه و عرض ندامت میکنم — اقتراحی چند در آداب صحبت میکنم
سنگ و خشت از مسجد ویرانه می آرم بشهر — خانه در کوی ترسایان عمارت میکنم
کرده ام ایمان خود را دستمزد خویشتن — می تراشم پیکر از سنگ و عبادت میکنم
چشم بر دور التفاتی در خیال آورده ام — هرچه دشمن میکند با دوست نسبت میکنم

گاه گاه از نظرم مست و غزلخوان بگذر — ورنه بر عهده من نیست که رسوا باشم

گرفته خاطر از اسباب و سرخوشی باقیست — ترانه که نه گنجد بساز میخواهم
برون میا که هم از منظر کناره بیام — نظارهٔ زور نیاز میخواهم

ز من حذر نکنی گر لباس دیں دارم — نهفته کافرم و بت در آستیں دارم

مسکین خبر از لذت آزار ندارد — خارم گل و در رهگذر چاره گرم ریز

ای سنگ بر تو دعوی طاقت مسلمست — خود را ندیده بکف شیشه گر هنوز

باهمه گم گشتگی خالی بود جایم هنوز — گاه گاهی در خیال خویشتن می آیم هنوز
تا سر خار کز این دشت در جان میخلد — کز هجوم شوق می خارد کف پایم هنوز

بے پردہ تاب محرمی راز ما مجوی — خوں گشتن دل از مژه و آستیں شناس

زرنگ و بوی گل و غنچه در نظر دارم — غبار قافله عمر و ناله جرسش
مرا بغیر ز یک جنس در شمار آورد — فغان که نیست ز پروانه فرق تا مگسش
خوشم که دوست خود آنانه بیوفا باشد — که در گمان فگنم امیدگاه کسش
بهار پیشه جوی که غالبش نامند — کنون ببین که چه خون میچکد زهر نفسش

وه در سودای تنق بست آسمان نامیدیش — دیده بر خواب پریشان زد جهان نامیدیش
وه بخاک ریخت در چشم بیابان دیدیش — قطره بگداخت بحر بیکران نامیدیش
بود دامن زد بر آتش نوبهاران خواندیش — داغ گشت آن شعله از مستی خزان نامیدیش
قطره خونی گره گردید دل دانستیش — موج زهر آبی بطوفان زد زبان نامیدیش
غربتم ناسازگار آمد وطن فهمیدیش — کرد تنگی حلقه دام آشیان نامیدیش
بود در پهلو به تمکینی که دل می گفتیش — رفت از شوخی به آئینی که جان نامیدیش
تا ز من بگسست عرض خوشدلش پنداشتم — چون بمن پیوست لختی بدگمان نامیدیش
او به فکر کشتن من بود و آه از من که من — لاابالی خواندیش نامهربان نامیدیش
در سلوک از هرچه پیش آمد گذشتن داشتم — کعبه دیدم نقش پای رهروان نامیدیش

ولکنت می تپد نبض رگ لعل گهربارش — شهید انتظار جلوه خویشم ست گفتارش
نه از حیرت کز غالب بمردن نیستی راضی — سرت گردم تو میدانی که مردن نیست دشوارش

تا دل به تمنا داده ام در کشمکش افتاده ام — اندوه فرصت یکطرف ذوق تماشا یکطرف
ای آنکه پیش نظر مستانه بےخود جلوه گر — رحمے بجان خویشتن کن غمخواری یکطرف

بیهزم باده گریبان کشودنش نگرید — خوشا بهانه مستی خوشا رعایت شوق

شکوه و شکر بهرزه و باطل — غالب و دوست آبگینه و سنگ

تا باده تلخ ترشود و سینه ریش تر — بگدازم آبگینه و در ساغر افگنم
راهی زکنج دیر به مینو کشوده ام — از خم کرشمه پیاله و در کوثر افگنم

شعله جلد غم کرا گل شگفته مژده کو — شمع شبستانیم باد سحرگاهیم
دور افتادم زیار ماهی بی دجله ام — هست دلم در کنار دجلهٔ بی ماهیم

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

ز چشم و دل بتماشا تمتع اندوزیم
ز جان و تن بمدارا زیاں بگردانیم

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم
بکوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم

اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

گل افگنیم و گلابے برہ گزر پاشیم
می آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

بمن وصالِ تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

دلا خوں گشتی و گفتی کہ ہی گردید کار آخر
مشو افسردہ غافل عالمی دارد چکیدن ہم

چہ خیزد گر نقابی از میاں برخاست تمکیں
کہ می بینم نقابِ عارضِ یار است دیدن ہم

دل از تمکیں گرفت و تابِ وحشت نبودم غالب
نگنجد در گریبانِ من از تنگی دریدن ہم

زخمِ جگرم بخیہ و مرہم نپسندم
موجِ گہرم جنبش و رفتار ندانم

نقدِ خردم سکۂ سلطاں نپذیرم
جنسِ ہنرم گرمیِ بازار ندانم

زانچہ دل ز ہم پاشد لب چہ طرف بربندد
یا مجالِ گفتن دہ یا نگفتہ باور کن

جنون مستم بفصلِ نو بہارم میتواں کشتن
صراحی برکف و گل در کنارم میتواں کشتن

بجرمِ اینکہ در مستی بپایاں بردہ ام عمری
بکوئے میفروشاں در خمارم میتواں کشتن

بہجراں زیستن کفر است خونم را دیت نبود
چراغِ صبحگاہم آشکارم میتواں کشتن

تغافلہائے یارم زندہ دارد ورنہ در بزمش
بجرمِ گریۂ بے اختیارم میتواں کشتن

جفا بر چوں منے کم کن کہ گر کشتن ہوس باشد
بذوقِ مژدۂ بوس و کنارم میتواں کشتن

منت معذور دارم لیکن اے نامہرباں آخر
بدیں جان و دلِ امیدوارم میتواں کشتن

بخونِ من اگر ننگ است دست و خنجر آلودن
نویدِ وعدہ کز انتظارم میتواں کشتن

گرفتم یار باشد بے نیاز از کشتنم غالب
بدردِ بے نیازیہائے یارم میتواں کشتن

در خلد ز شادی چہ رود بر سرم آیا
چوں کم نشود بادہ ز بسیار کشیدن

لب بر لبِ دلبر نہم و جاں بسپارم
ترکیب یکے کردنِ صد لخت ست ایں

خوش بود فارغ ز بندِ کفر و ایماں زیستن
حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

شیوۂ رنداں بے پروا خرام از من مپرس
اینقدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

بر نویدِ مقدمت صد بار جاں باید فشاند
بر امیدِ وعدہ ات زنہار نتواں زیستن

اگر بقدرِ وفا میکنی جفا حیف است
برگِ من کہ ازیں بیش میتواں کردن

مائیم و ذوقِ سجدہ چہ مسجد چہ بتکدہ
در عشق نیست کفر ز ایماں شناختن

لختِ دلم بدامن و چاکِ غم بجیب
اینک سزائے جیب و داماں شناختن

آزادیم نخواہی و ترسم کزیں نشاط
بالم بجود چنانکہ نگنجم ببندِ تو

دولت بغلط نبود ز سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

دارم دلے ز غصہ گرانبار بودۂ
بر خویشتن ز آبلہ چیزے فزودۂ

با دوستاں مباحثہ دارم ز سادگی
در بابِ آشنائیِ نا آزمودۂ

چوں زبانہا لال و جانہا پر ز غوغا کردۂ
باید از خویشش پرسید آنچہ با ما کردۂ

گر نہ مشتاقِ عرضِ دستگاہِ حسنِ خویش
جاں فدایت دیدہ را بہرِ چہ بینا کردۂ

صد گشاد آنرا کہ ہم امروز رخ بنمودۂ
مژدہ باد آنرا کہ محوِ ذوقِ فردا کردۂ

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است
خویش را در پردہ خلقے تماشا کردۂ

بلبل بگوشۂ قفس از خستگی منال
چوں من بہ بندِ خار و خسِ آشیاں نۂ

گوئی کہ نیست پیشِ تو بودہ نبودۂ من
با من نشستۂ و ز من سرگراں نۂ

یا بہ بساطِ دلبری عام مکن ادائے لطف
یا ز نگاہِ خشمگیں مژدۂ امتیاز دہ

گریہ بخوں کشودہ ام رخصتِ اشک آہ نیست
ہم بدے کہ بردۂ طاقتِ ضبطِ راز دہ

حسن در جلوہ گری بانگ شد منتِ غیر
ہر گل از خویشتنت آتش بداماں زدۂ

وائے بر من کہ رقیب از تو بمن بنماید
نامۂ واشدۂ مہر بعنواں زدۂ

بر دست و پائے بند گرانے نہادۂ
نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادۂ

بگوشم میرسد از دور آوازِ درا امشب
دلی گم گشتۂ دارم کہ در صحراست پنداری

غم چہ در پود از نا اینک آنچہ بود از ما
سینہ داند و بس خاطرے و آزاری

از مومن و کافر بر چہ دستگاہ آخر
سبحہ و سواکے قشقہ و زناری

شوخیِ شیمش بیں جنبشِ نشیمش بیں
غنچہ راست آہنگی سرو راست رفتاری

دو برقِ فتنہ بہقتند در کفِ خاکے
بلائے جبر یکے رنجِ اختیار یکے

فروز آئنہ خانہ کہ خوش تماشائیست
یکے تو محوِ خودی و چو تو ہزار یکے

نہ بے نگاہِ سبکسیر و شرمِ دور اندیش
یکے بدزدیِ دل رفت و پردہ دار یکے

رہ تن بخرابی دہ تا کارواں گردد
طوفاں زدہ زورق را بر موج عناں فنے

تابم ز دل برد کافر ادائے
بالا بلندے کوتہ قبائے

چوں مرگِ ناگہ بسیار تلخے
چوں جانِ شیریں اندک فائے

گستاخ سازے پوزش پسندے
طاقت گدازے صبر آزمائے

از زلفِ پرخم مشکیں نقابے
از تابشِ تن زریں ردائے

انتخاب کلام اُردو

(نیاز فتحپوری)

کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک سے تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
ہمیں دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اے موجِ گل نویدِ تماشائے کیستی
انگارۂ مثال سراپائے کیستی

بیہودہ نیست سعیِ صبا در دیارِ ما
اے بوئے گل پیامِ تمنائے کیستی

خوں گشتم از تو باغ و بہار کہ بودۂ
کشتی مرا بغمزہ مسیحائے کیستی

نشنیدہ لذتِ تو فرو میرود بدل
اے حرف محو لعل شکرخائے کیستی

باہیچ کافر اینہمہ سختی نمی رود
اے شب برگِ من کہ تو فردائے کیستی

رفت آنکہ کسبِ بوی تو از باد کردمے
گل دیدمے و روئے ترا یاد کردمے

رفت آنکہ گر لبت نہ بنفریں نواختے
رنجیدمے و عربدہ بنیاد کردمے

رفت آنکہ جانبِ رخ و قدت گرفتمے
در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمے

اکنوں خود از وفائے تو آزاری کشم
رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمے

چندم منہ ز طرہ کہ تابم نماندہ است
رفت آنکہ خویش را ببلا شاد کردمے

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو روئے نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

ہر کہ دلت دہد برش داغِ تو رو دہش ز دل
تا چہ بگیرے دہد باز بری بداوری

حیف کہ من بجوں تپم وز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ نشتری نالہ بسینہ خنجری

نیم ازاں گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

اعتبارِ شوق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہگزر یاد آیا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ!
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ کشتہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

محابا کیا ہے میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

بعد یک عمرِ ورع، بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا، ان کا پاسباں اپنا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو ہم اسے سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اے دلِ ناعاقبت اندیش، ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

حسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب، کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل سے کسی رنگ میں معذور نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

کب سے ہوں، کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش، جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

تم ان کے وعدہ کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیال مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے
مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

نہ اتنا برشِ تیغ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جب اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ڈھونڈھے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان، خدا ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلک ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اڑتا جائے ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

بیخودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کیے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذر دلفریبی عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
وہ جو اک لذت ہماری سعی بیحاصل میں ہے

میرے غم خانہ کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ
تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں مجھے
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے　　رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے
فلک نہ دور رکھ اس سے کہ میں ہی نہیں　　درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر　　کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے　　حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم　　میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں　　جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا　　تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں　　پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر　　کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت　　دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں　　اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے
اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ　　ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

دیکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف　　آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"　　تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل　　جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی　　تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی　　ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے　　بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے
غالبؔ تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا　　مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو　　کاشکے تم مرے لئے ہوتے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے　　کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل　　اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا　　ہاتھ آجائیں اگر ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ ڈالا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے　　تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے کیا کہئے　　ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہئے
یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے　　قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے
کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں لیکن　　سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہئے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں"　　مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے　　نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ　　خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن　　بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی　　وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبت میں ہے فرق جینے اور مرنے کا　　اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ　　پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم　　دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
عشق نے غالبؔ نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

انتخاب نسخۂ حمیدیہ

۱

تغافل بدگمانی - میری سخت جانی سے
نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیمِ گزند آیا

خورِ شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ
سر تا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک
شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینہ میں لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا

شوخیٔ رنگِ حنا خونِ وفا سے کب تک
آخر اے عہد شکن تو بھی پشیماں نکلا

وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے
مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

اے آہ، میری خاطرِ وابستہ کے سوا
دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا، سب تھا

بہ بخشش فرصتِ یک شبستاں جلوۂ خور نے
تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

مہربانیہائے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا
یارب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

ہیں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

اسدؔ بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ ہم تصویرِ عریاں ہیں

بے نوا ساز تماشا سر بکف جاتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں

بیدماغی حیلہ جوئے ترکِ تنہائی نہیں
ورنہ کیا موجِ نفس زنجیرِ رسوائی نہیں

ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا
اب اس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

جوہرِ آئینہ ساں مژگاں بدل آسودہ ہے
قطرہ جو آنکھوں سے ٹپکا سو نگاہ آلودہ ہے

واماندگیٔ عجز میں سامانِ آسائش کہاں
پریشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

تا چند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

نوعیت کا ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی اس کا دل دُکھنے لگتا تھا اور وہ گھبرانے لگی تھی۔ کون جانے بازروں کے دل کا کوئی ٹھکانہ نہیں کب کسی پر ٹھہر جائے۔

اسی اثنا میں ہوگ پہونچ گیا اور اُس نے ایک دن میری کے سامنے وہی تجویز نہایت وارفتگی کے عالم میں رکھی جو کسی دن ہیریٹ کے آگے رکھی تھی۔ میری کو اس وجیہہ و شکیل آدمی کی تجویز بری تو نہیں لگی۔ لیکن وہ صورت حال کو زیادہ گمبھیر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اس لئے ہوگ کو ناامید ہونا پڑا۔

اس کے بعد ہی ۲۲ فروری کو میری نے ایک بچہ کو جنم دیا۔ بچہ ساتویں مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے کمزور تھا۔ دو ہفتے کے بعد وہ چل بسا۔

اگلے سال ۱۸۱۶ء کے اوائل میں شیلی کی دوسری اہم شعری کاوش "الیسٹر" شائع ہوئی۔ اس غنائیہ نظم میں شیلی نے اپنی زندگی کی عظیم اور حسین آرزوؤں کی ناکامی کا المیہ نہایت دل نشیں انداز میں بیان کیا۔ تاہم ہیرو کی حرماں نصیبی کے باوجود حسن، خیر اور صداقت پر اپنے ناقابل تسخیر یقین کا اظہار کیا ہے۔

اس عظیم شہرۂ آفاق شعری پیش کش کا اس وقت ادبی دنیا میں بڑا تذکرہ رہا۔ اور یہ آج بھی شعری ادب میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

مئی ۱۸۱۶ء میں شیلی، میری اور جین کلیر جینوا کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں بائرن سے شیلی کی ملاقات پہلی بار ہوئی۔ شیلی نے اپنے ایک دوست کو لکھا۔

"لارڈ بائرن بڑا ہی دلچسپ شخص ہے۔
لیکن یہ بات افسوسناک نہیں ہے کہ
ایسا ذہین شاعر عورت اور محبت کے
بارے میں بڑے ہی نفرت انگیز نظریات
رکھتا ہے۔"

جو بھی ہو۔ جلد ہی دونوں میں خوب پٹنے لگی۔ حالانکہ دونوں کے مزاج میں اتنی ہی مماثلت تھی کہ دونوں ہی سماج سے ملعون اور راندۂ درگاہ تھے۔ ورنہ دونوں کے مذاق قطعی طور پر مختلف تھے۔ شیلی اپنی تمام حرکتوں کے باوجود محبت کے اندر پوشیدہ روحانی حسن کا پرستار تھا جبکہ بائرن محبت کے صرف جسمانی پہلو سے ہی متاثر تھا۔ جسمانی محبت کا رسیا بائرن اس حد تک چھلک کر پی چکا تھا کہ ردعمل کے طور پر اسے عورت ذات سے ہی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی شدید "عورت بیزار" ذہنی کیفیت میں جین کلیر حسن اور محبت کی بھٹکنے والی پیاسی روح کے مانند اس کے گرد منڈلانے لگی۔

جنسی بھوک سے پریشان یہ لڑکی شیلی سے جسمانی آسودگی نہ پاسکی اور اب شہرۂ آفاق شاعر، بدنام زمانہ عاشق مزاج اوباش "عورت خور" بائرن اُس کے خواب وخیال کا مرکز بن گیا۔ بائرن کی حد درجہ مردانہ وجیہہ شخصیت اور اس کی کچھ کچھ اُداس لیکن نشیلی آنکھوں میں خود کو ڈبو دینے کی شدید آرزو اُس کے دل میں بیدار ہوگئی تھی۔ بائرن بار بار اُسے دُھتکار دیتا اور اُس کی ہتک کرتا رہا۔ لیکن وہ ساری شرم و حیا کو دھو کر بہہ گئی اور اس کے پیچھے سایہ کے مانند چلتی رہی۔

بائرن بڑا ہی مغرور اور سرکش تھا اور کسی بھی انگریز ادیب شاعر سے اُس کی ذرا بھی نہیں پٹتی تھی۔ لیکن شیلی کو اس نے بڑا ہی معصوم اور پاکیزہ روح پایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی پرسکون اور خاموش طبیعت کے آگے بائرن کا سارا غرور ڈھ گیا۔ دونوں ہی کشتی رانی کے بڑے شوقین تھے روزانہ کشتی میں جھیل کی سیر کرتے ہوئے زندگی اور ادب کے مختلف مسائل کے تذکروں میں ڈوبے رہتے۔ دونوں کے خیالات میں اکثر زمین و آسمان کا فرق ہوتا۔ لیکن دونوں

ایک دوسرے کا احترام ہر حالت میں ملحوظ رکھتے تھے اور آہستہ آہستہ کہیں نہ کہیں وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے۔

جینوا روسو کی مولد تھی اور روسو نے وہاں کی فطرت کا جو دلکش بیان اپنی مشہور ناول "لا نوول ایلوئزا" میں کیا تھا اور اپنی مشہور عالم سوانح عمری "کنفیشنز" میں کیا تھا۔ اُسے شیلی نے بڑی والہانہ عقیدت سے پڑھا تھا۔ ان دلآویز مناظر کو دیکھ کر شیلی کو اس باغی ادیب مفکر کی یاد بار بار آتی تھی۔ روسو کی زندگی کی ساری ناکامیوں اور آوارگیوں کے باوجود شیلی اسے ایک پاکیزہ روح مانتا تھا۔

اسی سفر میں شیلی نے اپنی کئی مشہور نظمیں لکھیں اور بائرن نے اپنی مشہور عالم طویل نظم "پریزنر آف شلون" وہیں لکھی۔ ادبی ماحول اس خاموش پہاڑی میں اس قدر چھا گیا تھا کہ اور تو اور خود میری شیلی میں بھی لکھنے کی امنگ پیدا ہو گئی۔ اس ادبی فیضان کی ایک چھوٹی سی مگر بڑی ہی دلچسپ روداد ہے۔

بائرن اپنے بارے میں انگلینڈ میں اُٹھے طوفان سے تنگ آکر ہمیشہ کے لئے اپنے وطن کو خیرباد کہنے کا ارادہ کر کے آیا تھا۔ اُس کے ساتھ کچھ ملازم بھی تھے۔ ان میں ایک جان ولیم پولیڈوری نامی ایک نجی ڈاکٹر بھی تھا وہ ادیب کی حیثیت سے مشہور ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اسکی پاگل پن کی حد تک پہونچی ہوئی دلچسپی بھوت پریت اور جادو ٹونا میں تھی۔ ایک دن شام کے وقت سبھی دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ پولیڈوری نے موقع پاتے ہی بھوت پریت کے اپنے محبوب موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ وہ ان کے وجود پر یقین کرتا تھا اور ان کے بارے میں سامنے ثبوت بات بات میں فراہم کرتا تھا۔ اسی سلسلے میں اس نے بھوتوں سے متعلق ایک جرمن کہانی پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد بائرن نے کولرج کی "کرسٹابیل" سے کچھ لائنیں سنائیں۔ اس میں ایک جگہ پر ایک حسینہ کے بارے میں کہا گیا تھا۔

"وہ دیکھو ——— اُس کا سینہ ——— اُف توبہ"

شیلی میری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ جملہ سنتے ہی وہ یکبارگی خوف سے چلاتا ہوا کمرے سے نکل کر بھاگا۔ سبھی کو بڑا تعجب ہوا۔ جب کچھ دیر بعد شیلی لوٹ کر آیا تو اُس نے بتایا کہ میری کی جانب دیکھتے ہوئے جب اُس نے یہ جملہ سنا تو اُسے یکایک بچپن میں سُنی ایک کہانی یاد آئی جس میں ایک عورت کے سینے کے دونوں سرے پر دو چمکتی ہوئی آنکھیں جڑی ہوئی تھیں۔ اپنے ہی وحشت انگیز تصور سے ایک دم گھبرا کر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

اس پر سب ہنس پڑے۔ لیکن بائرن کو ایک دُور کی سوجھی اس نے تجویز رکھی کہ یہاں جتنے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ سب بھوت پریت کے بارے میں ایک ایک کہانی لکھیں۔ سب سے پہلے یہ کام میری شیلی کو سونپا گیا۔ میری نے فوراً ایک کہانی لکھ ڈالی۔ جس کا عنوان "فرینکسٹائن" رکھا گیا۔ یہ طویل کہانی اس دور کی ادبی دنیا میں شیلی کی نظموں سے زیادہ شہرت پا گئی۔ آج بھی اس لافانی کہانی کے تجزیے میں "فرینکسٹائن" ایک سمبل بنا ہوا ہے۔ شیلی کے انتقال کے کچھ دنوں بعد میری نے ایک ناول بھی "لوڈور" کے نام سے لکھا تھا۔ جس کا ہیرو بائرن اور شیلی کے ملے جلے کردار کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک اور کتاب اس نے "لاسٹ مین" کے نام سے لکھی جو شیلی کی زندگی پر ہے۔

۲۹ اگست ۱۸۱۶ء کو شیلی پھر ایک بار انگلینڈ واپس چلا گیا۔ میری اور کلیر ساتھ میں رہ گئیں۔ میری کو وہیں احساس ہو گیا کہ کلیر کی جنم جنم کی آرزو پوری ہوگئی ہے۔ اُسے بائرن سے پیٹ رہ گیا ہے۔ لیکن اس بات کو اس نے نہایت فطری طور پر قبول کیا۔ اس کے لئے نہ تو اُس نے بائرن کو الزام دیا اور نہ ہی کلیر کو۔ بائرن جیسے عظیم عاشق اور مشہور عالم شاعر سے پیٹ رہ جانا اُس نے کلیر کے لئے ایک فخر کی بات سمجھی۔ اس وقت تک شیلی اور اس کا خیال تھا کہ بائرن کلیر سے محبت کرتا ہے۔ انھیں پتہ نہیں تھا کہ جین کلیر بائرن کے دُر دُرانے پر بھی کس طرح اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی

شیلی جب کچھ دن بعد لندن سے لوٹ کر باتھ آیا تو